الغالب للطالب

(اتباعِ سنّت کی حقیقت)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	اہمیت حدیث	۷
۲	وسعتِ رحمت	۸
۳	''اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ'' کے معنی	۹
۴	تنبیہ	۱۰
۵	مقامِ ادب	۱۰
۶	صفاتَ باری کو اپنی صفات پر قیاس نہ کرو	۱۱
۷	سلامتی کی راہ	۱۲
۸	صحابہ رضی اللہ عنہم کا ادب	۱۳
۹	رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا غایت کرم	۱۴

۱۰	صفاتِ باری کی تحقیق میں ادب	۱۵
۱۱	حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کا حال	۱۶
۱۲	معرفت حق	۱۷
۱۳	معرفتِ حق کی لذت	۱۹
۱۴	ہجومِ خطرات	۲۰
۱۵	فضیلتِ انسان کی وجہ	۲۰
۱۶	اللہ کی حفاظت	۲۲
۱۷	مقامِ دوست	۲۳
۱۸	علمی نکتہ	۲۴
۱۹	جنت میں باقی رہنے والی دوستی	۲۴
۲۰	اہتمام صحبت	۲۶
۲۱	علمی تحقیق	۲۷
۲۲	امراضِ جسمانیہ میں لذت	۲۸
۲۳	اخلاقِ باطنیہ میں تعدیہ	۲۹

۲۴	بیوی کی دلداری	۳۰
۲۵	درجاتِ اتباع	۳۱
۲۶	خواجہ بہاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق	۳۳
۲۷	اتباعِ سنت	۳۴
۲۸	اتباعِ سنت میں لوگوں کا حال	۳۵
۲۹	اتباعِ سنت کی حقیقت	۳۶
۳۰	عمل اور مقصودیت	۳۷
۳۱	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ غالبہ معلوم کرنے کا معیار	۳۷
۳۲	بزرگوں پر اعتراض سے احتراز	۳۸
۳۳	ضرورت طلب	۳۹
۳۴	نیک خاتون کے ذکر کی برکت	۴۲
۳۵	شانِ محقق	۴۴
۳۶	ذکر بالجہر کا حکم	۴۵
۳۷	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ محبوبیت	۴۶

۳۸	حضور ﷺ کی احتیاط	۴۷
۳۹	رفعِ اشکال	۴۹
۴۰	تقاضائے اتباعِ سنت	۵۱
۴۱	ربطِ حدیث	۵۲
۴۲	صفاتِ اصلیہ کا اتباع	۵۴

وعظ

الغالب للطالب

(اتباعِ سنت کی حقیقت)

اتباعِ سنت کے متعلق یہ وعظ ۲۶ محرم الحرام ۱۳۴۷ھ بروز یکشنبہ تھانہ بھون میں حافظ ظریف احمد صاحب کے مکان پر کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا جو دو گھنٹے اور پینتالیس منٹ میں ختم ہوا۔

جہاں چالیس کے قریب مرد و عورتیں جمع تھیں یہ وعظ کاندھلہ کی ایک صاحبِ علم واعظہ کی درخواست پر ہوا جسے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے قلمبند فرمایا۔

خلیل احمد تھانوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ و بارک وسلم اما بعد:

فعن ابی ھریرۃ مرفوعًا(لَمَّا قَضَی اللّٰہُ الْخَلْقَ کَتَبَ کِتَابًا فَھُوَ عِنْدَہٗ فَوْقَ عَرْشِہٖ اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ)) وفی روایۃ ((غَلَبَتْ غَضَبِیْ)) متفق علیہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مرفوعاً نقل ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ نے خلق (تخلیق کائنات) کا فیصلہ فرمایا تو اپنے پاس عرش پر ایک کتاب میں یہ مضمون لکھ لیا کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے''۔

اہمیتِ حدیث

یہ ایک حدیث ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو خاص خصوصیت تھی ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور کوئی کام زراعت تجارت وغیرہ کا نہ کرتے تھے بلکہ متوکلانہ (۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر پڑے رہتے تھے اور احادیثِ نبویہ کو ہر وقت

(۱) اللہ پر بھروسہ کئے ہوئے۔

سنتے اور یاد کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ صحابہ میں سب سے زیادہ حافظِ حدیث ہیں۔ ان کے برابر کسی نے احادیث کی روایت نہیں کی۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس وقت اپنی چادر میرے سامنے پھیلا دے اور جب میں کچھ اس میں دم کردوں تو چادر کو اپنے سینے سے لگالے تو کوئی بات کبھی نہ بھولے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر پھیلا دی اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں کچھ پڑھ کر دم کردیا تو انہوں نے اس کو اپنے سینے سے لگالیا۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات کبھی نہ بھولا۔

یہ چند جملے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی تعریف میں اس لئے کہہ دیئے تاکہ ان کی روایت کی وقعت وعظمت ہو۔

وسعتِ رحمت

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معاملہ کی ہم کو اطلاع دی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے ساتھ کیا ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کا ایک ارشاد بھی مذکور ہے۔ ترجمہ حدیث کا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو مقدر کیا ((قضٰی)) کے معنی لغت میں فیصلہ کرنے کے ہیں مگر فیصلہ کی دو قسمیں ہیں ایک عملی ایک تجویزی۔ اگر عملی فیصلہ مراد ہو تو اس کا ترجمہ یوں ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کردیا یعنی انواع کو کیونکہ افراد تو سب پیدا نہ ہوئے تھے' اور اگر تجویزی فیصلہ مراد ہے تو ترجمہ یوں کیا جائے گا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کا خلق مقدر کیا کیونکہ تقدیر تجویز ہی تو ہے۔ غرض یا تو خلق تجویزی ہوا تھا یا عملی اجمالی ہوا تھا۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ ابھی تک مخلوق سے اعمال صادر نہ ہوئے تھے۔ اور اعمال کی دو قسمیں

ہیں ایک موجبِ رحمت (۱)۔ ایک موجبِ غضب (۲) تو اس وقت کسی قسم کے اعمال مخلوق سے صادر نہ ہوئے تھے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ایک معاملہ ایسا فرمایا کہ اپنے پاس عرش پر ایک کتاب میں یہ مضمون لکھ کر رکھا ((ان رحمتی سبقت غضبی)) کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

تو یہ مضمون بڑا معظم ہے (۳) جو عرش پر لکھ کر رکھا گیا ہے۔

استوی علی العرش کے معنی

عرش کو اللہ تعالیٰ سے خاص قرب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو عرش سے خاص تعلق ہے اسی تعلق کو استویٰ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے یہ معنی نہیں کہ جس طرح ہم تم بیٹھے ہیں اسی طرح معاذاللہ وہ بھی بیٹھے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس سے منزہ ہونے پر دلائل عقلیہ اور نقلیہ قائم ہیں دلیل نقلی تو ''لیس کمثله شیء'' اس جیسا کوئی نہیں) اور دلائل عقلیہ سے علماء واقف ہیں۔

حضرات صوفیاء نے اس مسئلہ کو بہت سہولت سے حل کر دیا ہے۔ واقعی یہ حضرات سچے وارث ہیں انبیاء علیہم السلام کے جس طرح حضرات انبیاء سہل عنوان سے مشکل مسائل کو تعبیر کر دیتے ہیں ایسے ہی صوفیاء کی عادت ہے کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو آسان عنوان سے حل کر دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مکان کو متمکن سے کچھ مناسبت وقرب مقدار تو ہونا چاہئیے۔ اول تو عادۃً مکان مکین سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر زیادہ نہ بھی ہو تو مساوات تو ہے اور کم از کم کسی قدر مناسبت ونسبت تو ہونی چاہئیے اور عرش کو حق تعالیٰ سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ اگر عرش حالتِ موجودہ سے کروڑوں گنا بھی بڑا ہو جب بھی اس کو حق تعالیٰ سے کچھ مناسبت نہ ہوگی۔ کیونکہ عرش محدود

(۱) رحمت کا باعث (۲) غضب کا باعث (۳) قابل تعظیم۔

ہے اور ذاتِ حق (۱) غیر محدود ہے اور محدود کو غیر محدود سے کیا مناسبت؟ کچھ بھی نہیں پھر وہ اس کے لئے مکان کیسے ہوسکتا ہے البتہ حق تعالیٰ سے عرش کو خاص تعلق ہے اور حق تعالیٰ کو اس سے تعلق ہے مگر تحیز کا تعلق نہیں ہے بس وہ صدر مقام ہے نزول احکام وتجلیات کا۔ اللہ تعالیٰ کی تجلیات سب سے زیادہ عرش پر ہیں یعنی امکنہ (۲) جو چیز لکھ کر رکھی جائے گی وہ بڑی عظمت کی ہوگی (۳) پس عقیدۃً بھی اس کا حق عظمت ادا کرنا چاہئے اور عملاً بھی وہ مضمون یہ ہے ((ان رحمتی سبقت غضبی))

تنبیہ

اس مقام پر ایک بات اور بھی سمجھنا چاہیے وہ یہ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت وغضب کو اپنے رحم وغضب پر قیاس نہ کرلے یہ سخت غلطی ہے۔ کیونکہ جس طرح کسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی کنہ معلوم نہیں اسی طرح صفات کی کنہ بھی معلوم نہیں۔ حضراتِ علماء نے اس مقام پر بڑی تحقیق سے کام لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ صفات واسماءِ الٰہیہ توقیفی ہیں جن میں قیاس جائز نہیں۔

مقامِ ادب

علماء نے اس قدر ادب کیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو طبیب کہنا جائز نہیں ہاں شافی کہنا جائز ہے۔ یہاں رائے وعقل سے کام لینا جائز نہیں کیونکہ۔

دور بینان بارگاہِ الست　　غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

حالانکہ بظاہر طبیب میں کچھ خرابی نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ طب کہتے ہیں تدبیر شفا کو اور اللہ تعالیٰ کے لئے تدبیر ثابت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی

(۱) اللہ تعالیٰ کی ذات (۲) مکان کی جمع (۳) اللہ رب العزت نے اپنے پاس عرش پر ایک کتاب میں یہ مضمون لکھ کر رکھا ہے یہ مضمون بڑا معظم ہے۔

عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ﴾ (۱) مگر چونکہ نصوص میں اللہ تعالیٰ پر طبیب کا اطلاق وارد نہیں اس لئے علماء نے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ ممکن ہے کہ طب میں کوئی بات ایسی ہو جو کہ عظمت کے منافی ہو۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے وائسرائے میں اگرچہ کانسٹیبل کے اختیارات بھی ہیں کیونکہ کانسٹیبل کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ اسی کے دیئے ہوئے ہیں مگر وائسرائے کو کانسٹیبل کہنا جائز نہیں۔ اور اگر کوئی وائسرائے کو کانسٹیبل کہنے لگے تو مجرم قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔

پس جو حالت ہمارے رحم کی ہے کہ ہمارا دل کُڑھتا ہے اس پر حق تعالیٰ کے رحم کو قیاس نہ کرو کہ معاذ اللہ ان کا دل بھی کُڑھتا ہوگا۔ یہ اعتقاد باطل اور حرام ہے۔ اسی طرح استوی علی العرش میں حق تعالیٰ کے استویٰ کو اپنے استویٰ پر قیاس نہ کرو۔

صفاتِ باری کو اپنی صفات پر قیاس نہ کرو

ایک محقق کا ارشاد ہے کہ استوی کے معنی استقرار (۲) کے ہیں مگر ہر شے کا استقرار جدا ہے جیسے ادراک مستوی کی (۳) حقیقت معلوم ہونے پر موقوف ہے اور کنہ باری (۴) معلوم نہیں تو حقیقت استویٰ پر گفتگو عبث ہے (۵)۔ واقعی اس امت کے علماء ورثہ الانبیاء ہیں۔ مگر ایسے جیسے یہ حضرات محققین تھے نہ ہم جیسے علماءٔ اسی طرح غضب کی حقیقت ہمارے اندر جوش کا پیدا ہونا اور

---

(۱) سورۂ یونس: ۳ (۲) قرار پکڑنے کے ہیں (یعنی جمنا) (۳) قرار کی حقیقت معلوم ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جس کے قرار پکڑیں اس کی حقیقت معلوم ہو (۴) اللہ کی حقیقت ذات معلوم نہیں (۵) بیکار ہے۔

بے قابو ہو جانا ہے جس میں بعض اوقات منہ سے کف (۱) بھی نکلتا ہے اس پر حق تعالیٰ کے غضب کو قیاس نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے غالب نہیں ﴿بَلْ هُوَالْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ﴾ ''بلکہ وہ غالب ہیں اپنے بندوں پر'' اللہ تعالیٰ قاہر ہیں مقہور نہیں غالب ہیں مغلوب نہیں۔ ان کا غضب ورحم اختیاری ہے یعنی یہ صفات درجہ صفات میں قدیمہ (۲) ہیں اختیاری نہیں اور قدیم میں تغیّر محال ہے ورنہ امکان خلو عن الصفات لازم (۳) آئے گا اور یہ محال ہے مگر ان صفات کا نفاذ اختیاری ہے کوئی صفتِ قدیمہ بدون ارادہ حق کے نافذ نہیں ہو سکتی (۴) تو جس پر قدیم بھی غالب نہیں اس پر حادث کیسے غالب ہوگا۔

رہا یہ کہ پھر حق تعالیٰ کے غضب و رحمت کے کیا معنی ہیں؟ سو علماء نے ''رحمت'' کی تفسیر ارادۃ النواب اور ''غضب'' کی ارادۃ العقاب (۵) کی ہے اور میرے نزدیک یہ بھی محض تفہیم کے لئے ایک عنوان ہے یہ بھی حقیقت نہیں میرے نزدیک صفات تو کیا افعال الہیہ کی بھی کنہ کسی کو معلوم نہیں۔ اسی لئے حضرات انبیاء علیہم السلام نے کیفیت افعال سے تو سوال کیا ہے۔ ﴿رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی﴾ (۶) ﴿وَاَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (۷)

سلامتی کی راہ

مگر حقیقتِ افعال سے کہیں سوال وارد نہیں حضرات انبیاء علیہم السلام بڑے مؤدّب تھے کہ جس بات کے سمجھنے کی توقع نہیں ہوتی اس کو پوچھتے بھی نہیں

(۱) منہ سے جھاگ نکلتی ہے (۲) ہمیشہ سے ہیں (۳) ورنہ کسی وقت خدا کا ان صفات سے خالی ہونا لازم آئے گا جو محال ہے (۴) کوئی بھی صفت قدیم بغیر اللہ کے حکم کے نافذ نہیں ہو سکتی (۵) رحمت کرنے کا ارادہ اور سزا کا ارادہ (۶) اے میرے رب مجھے دکھا دیجئے' آپ کیسے مردوں کو زندہ کرتے ہیں؟ (۷)۔

تھے اسی لئے سوال عن کیفیتہ الافعال کے بعد دوبارہ سوال حقیقت سے نہیں کہا، ہمارے حضور ﷺ نے بھی اپنی امت کو بھی یہی طریقہ سلامتی کا تعلیم کیا ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے کہ جو امور فہم میں نہ آسکیں ان میں غور وخوض نہ کیا جائے یہ بڑا ادب ہے اور واللہ اسی میں سلامتی ہے اور سکون واطمینانِ قلب بھی اسی میں ہے چنانچہ حضور ﷺ نے مسئلہ قدر میں غور کرنے سے منع فرمایا کیونکہ اس کا تعلق افعال وصفاتِ باری تعالیٰ سے ہے جن کی کنہ کا علم تو محال ہے اور اگر وجہ معلوم ہو بھی گئی تو ایک وجہ کے لئے پھر دوسری وجہ ہوگی۔ پھر اس سلسلہ وجوہ سے وہ حالت ہوگی کہ

ع شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا (۱)

مگر آج کل بعض لوگ ایسے بدد ماغ ہیں کہ اس ادب کی قدر نہیں کرتے بلکہ متشابہات اور مسئلہ قدر میں گفتگو کرتے ہیں مگر ان سے کوئی قسم دے کر پوچھے کہ کیا تم کو گفتگو اور غور وخوض سے سکون واطمینان حاصل ہوا۔ ہرگز نہیں! واللہ ایک جاہل مسلمان کو قدر میں جتنا اطمینان ہے۔ ان گفتگو کرنے والوں کو اس کا دسواں حصہ بھی مشکل سے ہوتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہ کا ادب

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا ادب دیکھئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر ضحک فرماتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑ کر جنت کی طرف لائے جاتے ہیں (یعنی جہاد میں بعض کافر زنجیروں قید ہو کر آتے ہیں پھر اہل اسلام کی صحبت سے مسلمان ہو جاتے ہیں تو گویا یہ لوگ زنجیروں میں جکڑ کر

(۱) میرے خواب کی لوگوں نے اتنی تعبیریں بیان کی کہ میں ان سے پریشان ہو گیا۔

جنت کی طرف لائے گئے) اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ سوال نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح ضحک فرماتے ہیں بلکہ یہ حدیث سنتے ہی خوش ہوئے اور کہا یا رسول اللہ جب اللہ تعالیٰ ضحک بھی فرماتے ہیں تو ایسے خدا سے تو ہم کو بڑی امیدیں ہیں'' واقعی خدا ہمارا ایسا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مہربان جنہوں نے ہم کو یہ باتیں بے تکلف بتلادیں ورنہ دوسرا مصلح تو اسی سوچ میں رہتا کہ اس بات کو بیان کروں یا نہ کروں۔ کہیں مصلحت کے خلاف تو نہیں۔ کبھی لوگ خدا تعالیٰ کی ایسی رحمت و مہربانی کو سن کر دلیر نہ ہو جائیں۔

جیسے حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس سال تک رحمتِ الٰہیہ کا بیان فرمایا پھر خیال ہوا کہ شاید لوگ دلیر ہوگئے ہوں گے۔ تو ایک دن غضبِ الٰہی کا بیان فرمایا۔ وہ ایسا غضب کا بیان تھا کہ مجلس میں سے چند جنازے اٹھے۔ کئی آدمی خوف سے مرگئے تو آپ پر بذریعہ الہام کے عتاب ہوا کہ تم نے ہمارے بندوں کا دل توڑ دیا۔ کیا ہماری رحمت اتنی ہی تھی کہ تمہارے چالیس سال کے بیان میں ختم ہوگئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غایت کرم

میں کہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خیال ہوتا جو حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا تو ہم کو حق تعالیٰ کی رحمت و لطف و ضحک کی خبر کیونکر ہوتی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بیان کرنے میں ذرا پس و پیش نہیں ہوا تو اللہ تعالیٰ ایسے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ایسے۔ پس یہ شعر پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

یا رب تو کریمی و رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو کریم — صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

''اے رب! تو بھی کریم اور تیرا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کریم سو شکر ہے کہ میں دو کریموں کے درمیان ہوں۔

اور سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

نماند بعصیاں کسے درگرو که دارد چنیں سیّدِ پیش رو

صفاتِ باری کی تحقیق میں ادب

غرض اللہ تعالیٰ کی صفات وافعال میں قیاس سے کام نہ لو۔ اللہ تعالیٰ صاحبِ رحمت بھی ہیں اور صاحبِ غضب بھی ہیں۔ وہ ضحک بھی فرماتے ہیں صاحبِ ید و وجہ بھی ہیں۔ صاحب قدم وساق بھی ہیں مگر اپنے ید و وجہ وقد وساق پر قیاس نہ کرو (۱) اور ہاں اللہ تعالیٰ صاحب فخذ (۲) نہیں ہیں کیونکہ نصوص میں اس کا ذکر نہیں اور قیاس جائز نہیں۔ یہ اس لئے میں نے کہہ دیا کہ شاید کوئی عقل کا پورا قیاس سے یوں کہنے لگے کہ جب وجہ و ید و قدم وساق ہے تو ان کے درمیان کی چیزیں فخذ وغیرہ بھی ہوں گی اس کا یہ جواب دیا جائے گا ۔

تو نہ دیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبانِ مرغاں را

''تم نے کبھی سلیمان علیہ السلام کو آنکھ سے تو دیکھا نہیں پھر تم پرندوں کی بولی کب سمجھ سکتے ہو''۔

جیسے ایک بزرگ نے فرمایا تھا اس شخص کے جواب میں جس نے دریافت کیا کہ شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا باتیں کی ہیں فرمایا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغبان بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد (۳)

لوگ اولیاء اللہ کو خدا کا راز دار سمجھتے ہیں کہ ان سے ایسے سوالات کرتے

(۱) خدا کے ہاتھ منہ پنڈلی اور پیر بھی ہیں لیکن ان کو اپنے ہاتھ منہ پر قیاس نہ کرو یعنی ایسے نہیں جیسے تمہارے ہیں (۲) ران (۳) میرے پاس ایسا دماغ کہاں ہے کہ میں باغبان سے پوچھوں کہ بلبل نے کیا کہا پھول نے کیا سنا ہوا نے کیا کیا۔

ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے کسی مجذوب سے پوچھا کہ یہ بادشاہت کب تک رہے گی۔ مجذوب نے دھمکا کر جواب دیا کہ کیا میں خدا کا رشتہ دار یا سررشتہ دار ہوں جو ان باتوں کی مجھے خبر ہو' مجھے غیب کی کیا خبر۔

حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کا حال

حالانکہ مجاذیب اکثر امورِ تکوینیہ کو ظاہر کر دیا کرتے ہیں۔ مگر بعض مجذوب مؤدب بھی ہوتے ہیں۔ جیسے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کی تعریف میں نے حضرت حاجی صاحب سے سنی ہے سالکین کی زبان سے مجذوبوں کی تعریف کم سنی جاتی ہے ہمارے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کی تعریف حضرت نے بہت کی ہے اور یہ حافظ صاحب صرف ایک کمبل میں رہتے تھے مگر کبھی برہنہ(۱) نہیں دیکھے گئے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک بار جلال آباد تشریف لے گئے وہاں کے پٹھانوں نے کہا' حضور نے قدم رنجہ فرمایا' تو ان کو ادب سکھلایا کہ بزرگوں سے یوں نہیں کہا کرتے کہ قدم رنجہ فرمایا' کیا ہم کسی کے نوکر ہیں کہ قدم رنجہ فرماتے' بلکہ یوں کہا کرتے ہیں کہ حضور نے کرم فرمایا۔

تو وہ مجذوب بھی مؤدب تھے جنہوں نے یہ فرمایا کہ خدا کا رشتہ دار یا سررشتہ دار ہوں۔ اس لئے یہ سوال ان کو ناگوار ہوا جس میں غیب سے استفسار(۲) تھا۔ یہ ایک ضروری مضمون تھا'' سبقت رحمتی علی غضبی ''(۳) کے متعلق کہ حق تعالیٰ کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس نہ کرنا چاہیئے۔

---

(۱) ننگے (۲) انہوں نے اس سوال میں غیب کی بات پوچھی تھی اس لئے ناگواری ہوئی (۳) میری رحمت میرے غصہ سے بڑھی ہوئی ہے۔

معرفتِ حق

اب میں مقصود کی طرف عود (۱) کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب میں جو عرش پر ہے قبل ہمارے وجود کے اور قبل وجود ان افعال کے جو موجبِ رحمت وغضب ہیں (۲) اپنے پاس یہ لکھ لیا ہے کہ میری رحمت غضب سے بڑھی ہوئی ہے یعنی میری رحمت غضب پر غالب ہے بس بلا تکلّف یہ حالت ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ما نبودیم وتقاضا ما نبود لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

یعنی حق تعالیٰ کا لطف اس وقت ہمارے شامل حال تھا جب کہ نہ ہمارا وجود تھا نہ ہماری طرف سے کچھ تقاضا تھا۔

یہاں ایک بات اہلِ علم کے سمجھنے کی یہ ہے کہ "سبقت رحمتی علی غضبی" پر بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ صفاتِ قدیمہ میں سبقت وغلبہ کیسے ہوسکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہاں صفات قدیمہ میں سبقت و غلبہ مراد نہیں بلکہ ان کے تعلق میں سبقت وغلبہ مراد ہے اور تعلق حادث ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ اگر کسی شخص میں اسبابِ غضب و اسبابِ رحمت دونوں مجتمع (۳) ہوں تو اس پر رحم ہو ہی جاتا ہے اب اشکال کچھ نہیں۔

یہ تو حدیث کے متعلق لفظی تحقیق تھی۔ اب میں اس سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا چاہتا ہوں (۴) جس کی طرف ابھی تک ذہن نہ گیا ہوگا۔ اور اس کی ضرورت عوام کو نہیں کیونکہ جس غلطی کا ازالہ اس وقت کیا جائے گا وہ عوام کو پیش نہیں آتی وہ

---

(۱) لوٹتا ہوں (۲) وہ صفات جو ہمیشہ سے ہیں ان میں پہلے اور غالب ہونا کیسے ہوسکتا ہے (۳) دونوں جمع ہوں (۴) مسئلہ نکالنا چاہتا ہوں۔

ان امراض سے بری ہیں جیسے وہ بدہضمی کے مرض سے بری ہوتے ہیں۔

چنانچہ ایک دیہاتی کو کسی حکیم نے دیکھا کہ اس نے روٹی کھا کر اوپر سے چھاچھ کا بدھنا بھرا ہوا پی لیا۔(۱)حکیم صاحب نے کہا کہ کھانے کے بعد چھاچھ پینا مضر ہے(۲) اس کو درمیان میں پینا چاہئے۔تو اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی کہ ارے فلانے چار ٹکڑ (موٹی روٹیاں) اور لے آ' اس چھاچھ کو بیچ کرلوں (۳) یہ حکیم کہہ رہا ہے کہ اسے بیچ میں کرلے چنانچہ وہ چار مچنگ (۴)اور لایا اور چوہدری صاحب وہ بھی کھا گئے پھر حکیم سے کہا کہ حکیم جی اب تو نقصان نہ ہوگا۔حکیم صاحب نے کہا کہ بھائی تو قواعدِ طب سے مستثنیٰ ہے تجھے کسی طرح مضر نہیں۔

تو جیسے عوام بہت سے ظاہری امراض وخطرات سے بری ہیں ایسے ہی بہت سے باطنی امراض وخطرات سے بھی بری ہیں کبھی خواص سے مل کر ان میں بھی یہ امراض پیدا ہوجاتے ہیں۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ پھر دیہاتی ہونا ہی بہتر ہے۔نہیں ہرگز نہیں کیونکہ دیہاتی گو بعض امراض سے محفوظ ہیں مگر بہت سے لطفوں (۵) سے محروم ہیں۔شہر والوں کو لطف بہت حاصل ہیں۔اسی طرح خواص کو لطف بہت ہے کہ ان کو عوام سے زیادہ اللہ اور رسول ﷺ کی معرفت ہے۔(۶)اور معرفت وہ چیز ہے کہ جنت بھی اسی کی ایک فرع ہے (۷)۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ کو بچپن میں مرجانا اور خطرات سے محفوظ ہونا پسند ہے یا بالغ ہوکر خطرہ میں پڑنا پسند ہے۔فرمایا کہ مجھے بالغ ہوکر خطرہ میں پڑنا زیادہ پسند ہے بچپن کی موت پسند نہیں کیونکہ بلوغ کے بعد معرفت حق عزوجل زیادہ ہوتی ہے جو بچپن میں نہیں ہوتی۔

---

(۱) لسی کا ڈول بھرا ہوا پی لیا تھا (۲) کھانے کے بعد لسی پینا نقصان دہ ہے (۳) اس لسی کو درمیان میں کرلوں (۴) چار بڑی بڑی روٹیاں اور لایا (۵) مزوں سے بھی محروم ہیں (۶) پہچان (۷) ایک شاخ۔

حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ اسی معرفت پر خوش ہو کر فرماتے ہیں

شکر للہ کہ نمردیم ورسیدیم بدوست　　　آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ ما (۱)

معرفتِ حق کی لذت

میں نے حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ بھائی جنت کا مزہ برحق، کوثر کا مزہ برحق، مگر نماز میں جو مزہ ہے وہ کسی چیز میں نہیں۔ جب ہم سجدہ میں جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے پیار کرلیا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ہم جنت میں جائیں گے اور حوریں آئیں گی تو ہم ان سے کہہ دیں گے کہ بی اگر قرآن سناؤ بیٹھو ورنہ چلتی بنو۔

تو حضرت معرفت ایسی لذت شے ہے (۲) کہ عارفین کے نزدیک جنت اور حوروں میں بھی وہ مزہ نہیں جو اس میں ہے۔ اور اس سے نعمائے دنیا (۳) کا کہ ان میں معرفت بھی ہے نعمائے جنت سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ جنت میں یہ معرفت ایسی ہوگی کہ وہاں کی نعمت سے زیادہ لذیذ ہوگی۔ تو خود جنت کی بعض نعمتیں بعض سے افضل ہوئیں۔ باقی ہم جیسوں سے کوئی پوچھے ہم تو یوں کہیں کہ روٹیوں میں زیادہ مزہ ہے نماز میں کیا مزہ ہے، اور فقہاء نے ہم جیسے ضعفاء کے لئے وسعت بھی دے دی ہے کہ اگر کھانا سامنے ہو اور نماز ہونے لگے تو روٹی پہلے کھالو نماز بعد میں پڑھ لینا تاکہ نماز فراغت سے پڑھی جائے ورنہ ساری نماز میں روٹی ہی کا خیال رہے گا کیونکہ تمہارے نزدیک روٹی میں مزہ زیادہ ہے۔ اور اسی

(۱) اللہ کا شکر ہے کہ میں دوست تک پہنچ گیا ہوں راستہ میں مرا نہیں میری اس جواں ہمت پر آفرین ہے
(۲) عمدہ چیز ہے (۳) دنیا کی نعمتوں کا۔

لئے شریعت نے تعجیل افطار(۱) کا حکم دیا ہے کہ نماز مغرب سے پہلے افطار کر لینا چاہئیے اور حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:((للصائم فرحتان فرحة عند فطره وفرحة عند لقاء الرحمن))

کہ ’’روزہ دار کو دو خوشیاں ہیں ایک افطار کے وقت ہوتی ہے دوسری اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت ہوگی‘‘۔

ہم لوگوں کو افطار کے وقت خوشی اسی کی ہوتی ہے کہ کھانے کو ملا منہ کا تالا کھل گیا مگر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو جو مسرت تھی وہ اس بات پر تھی کہ منزل پوری ہوگئی خدا کا حکم ادا ہوگیا۔

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدم بدوست آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

ہجومِ خطرات

بہر حال خواص کے مراتب زیادہ ہیں گو ان کو خطرات بھی بہت ہیں ایک بار مجھ پر ایک سخت حالت تھی۔ اس وقت میں تمنا کرتا تھا کہ کاش میں قرآن کا ترجمہ نہ سمجھتا کیونکہ وہ حالت ترجمہ سمجھنے ہی کی تھی بعد میں ہوش آیا کہ یہ تمنا ناشکری کی ہے بلکہ ہم لوگوں کو خطرات سے بچنے کی ہمت کرنی چاہئے۔ اور ان لذتوں سے خوش ہونا چاہیے خواص کو خطرہ بے شک بہت ہے مگر اسی وجہ سے تو ان کے مراتب زیادہ ہیں۔

فضیلتِ انسان کی وجہ

ملائکہ سے نوع بشر(۲) اسی لئے افضل ہے کہ ملائکہ کو خطرہ نہیں اور انسان

(۱) افطار میں جلدی کرنے کا حکم دیا ہے (۲) فرشتوں سے انسان اسی لئے افضل ہے۔

کو خطرہ ہے حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت (۱) کو پیدا کیا، تو ملائکہ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا۔ ((یا رب خلقتھم یا کلون فیشربون وینکحون ویرکبون واجعل لھم الدنیا ولنا الاخرۃ))

کہ ''اے اللہ! انسان کو دنیا دیجئے اور ہم کو آخرت دے دیجئے'' ارشاد ہوا:

((لا اجعل من خلقته بیدی ونفخت فیه من روحی کمن قلت کن فکان))

''کہ ایسا نہیں ہوسکتا کیا میں ایسی مخلوق کو جسے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے اس کے برابر کردوں جس کو کن کہہ کر پیدا کردیا''

تو یہ فضیلت انسان کی ان خطرات ہی کی وجہ سے تو ہے جو ملائکہ کو درپیش نہیں۔ بعض لوگ ذکر میں لذت اور مزہ کے طالب ہیں۔ ارے بس رہنے دو یہ مزا نہ آنا بھی رحمت ہے کیونکہ مزہ کے بعد ثواب کم ہوجاتا ہے۔ دیکھو ملائکہ کو عبادت میں لذت حاصل ہے اور انسان عام طور پر طاعات میں لذت (۲) سے خالی ہیں مگر ثواب زیادہ انسان ہی کو ہے۔ بس تمہارا تو یہ مذاق ہونا چاہئے۔

ناخوشِ تو خوش بود برجانِ من دل فدائے یار دل رنجانِ من (۳)

پھر بعض دفعہ لذت سے انبساط بڑھ جاتا اور ادلال (۴) ہوجاتا ہے جو کبھی گستاخی کی حد سے قریب ہوجاتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک دعا کی، اس کا جواب الہام سے عطا ہوا۔ اس کے جواب میں آپ نے ایک کلمہ ایسا فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب یا مولانا گنگوہی صاحب اس کو سن کر

---

(۱) اولاد (۲) عام طور پر انسان کو عبادات میں لذت حاصل نہیں (۳) مجھے وہ ناپسندیدہ بات بھی پسند ہے جس سے محبوب خوش ہو اس لئے کہ میرا دل تو محبوب پر فدا ہے (۴) لذت سے خوشی ہوکر نازک حالت پیدا ہوجاتی ہے۔

کانپ گئے اور فرمایا کہ یہ انہی کا مرتبہ ہے جو ایسی بات کہہ گئے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو کان پکڑ کر باہر نکال دیا جاتا۔

بہرحال خواص کو خطرات سے نہ گھبرانا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ دار و دیکھ کر مرض (۱) دیتے ہیں خواص کو جس طرح خطرات بہت ہیں اسی طرح ان میں تحمل کی طاقت بھی زیادہ ہے (۲) اگر عوام کو یہ امراض وخطرات ہوتے جو خواص کو درپیش ہوتے ہیں تو وہ اُن کا تحمل بھی نہ کر سکتے۔ جیسا کہ بچوں کو خطرات بہت پیش آتے ہیں مگر ان کی تائید (۳) بھی بالغوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ بچے بہت گرتے پڑتے ہیں۔ بعض دفعہ بہت اونچے سے گر جاتے ہیں مگر ان کو زیادہ چوٹ نہیں آتی، بڑا آدمی تو مر ہی جائے۔ میاں جی ظالموں کی طرف سے بچوں پر بہت زیادتی ہوتی ہے۔ اگر میاں جی کو اتنا پیٹا جائے تو وہ بستر ہی سے نہ اٹھ سکیں مگر بچے اگلے ہی دن آجاتے ہیں۔

اللہ کی حفاظت

بچوں کی حفاظت پر ایک یہ حکایت یاد آئی کہ ایک عورت ریل میں سفر کر رہی تھی اور اس کے ایام وضع قریب تھے (۴)۔ وہ جو ضرورت سے ریل کے پاخانہ (۵) میں گئی اسی وقت اس کے درد شروع ہوا اور بچہ نکل کر لیٹرین کے سوراخ سے نیچے گر پڑا ماں یہ ماجرا دیکھ کر تڑپ گئی اور سخت بے چین ہو کر باہر آئی اور ریل کے روکنے کے لئے زنجیر کو کھینچ لیا۔ ریل رکی اور گارڈ وغیرہ کو یہ قصہ معلوم ہوا تو فوراً ڈرائیور انجن کو اکیلا لے کر پیچھے لوٹا۔ دور جا کر بچہ پر نظر پڑی کہ دونوں پٹریوں کے

(۱) علاج دیکھ کر مرض دیتے ہیں (۲) برداشت کی طاقت (۳) مدد (۴) اس کے بچہ پیدا ہونے کے دن قریب تھے (۵) بیت الخلاء۔

درمیان پڑا ہاتھ پیر چلا رہا تھا اور ساتھ انگوٹھا چوس رہا تھا اور اس کے بدن پر کسی جگہ بھی چوٹ نہ آئی تھی۔ ڈرائیور نے دوڑ کر اس کو اٹھایا اور خوشی خوشی واپس لوٹا اور ماں کو لاکر دے دیا۔ وہ گویا مر کر زندہ ہوگئی اور پھر ریل روانہ ہوگئی۔

تو جیسے بچوں کو خطرات میں امداد وتائید ہوتی ہے اسی طرح خواص کی تائید ہوتی ہے اس لئے ان کو گھبرانا نہ چاہئے۔

مقامِ دوست

اب میں اس مضمون کو بیان کرتا ہوں جو اس حدیث سے مستنبط کرنا مقصود ہے گو وہ مضمون دقیق ہے[۱] مگر زیادہ دقیق نہیں ہاں عوام اور مستورات کے سامنے بیان کرنے کا نہیں تھا اسی لئے مجھے تردّد تھا[۲] کہ اس کو عورتوں کے مجمع میں بیان کروں یا نہ کروں۔ مگر بعض دفعہ دقیق مضامین بیان کرکے جب مستورات سے پوچھا گیا کہ تم نے کیا خاک سمجھا ہوگا، تو انہوں نے کہا کہ ہم تو سمجھ گئے۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہے اس لئے ہمت کرتا ہوں میرا ارادہ اس مضمون کے بیان کرنے کا پہلے ہوا تھا مگر یہ خیال تھا کہ مجمع خواص میں بیان کروں گا۔ جب مستورات کی طرف سے درخواست بیان کی ہوئی تو دوسری آیت کے بیان کا ارادہ ہوا یعنی ﴿يَآاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾ [۳]

مگر پھر رائے بدل گئی لیکن اس آیت کا ترجمہ تو کردوں تاکہ اس آیت کا کچھ بیان بھی ہوجائے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ مسلمان کو مرتے وقت ملائکہ اس طرح بشارت دیں گے کہ ''اے نفس مطمئنہ تو اپنے پروردگار کی طرف واپس چل اس حال میں

(۱) ذرا مشکل ہے (۲) ہچکچاہٹ تھی (۳) سورۃ الفجر: ۳۰۔

کہ تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہیں پس تو میرے خاص بندوں (کی جماعت) میں داخل ہوجا اور میری جنت میں پہنچ جا'' یہ تو ترجمہ ہوا۔

علمی نکتہ

اب ایک نکتہ بھی بیان کردوں وہ یہ کہ آیت میں ﴿اُدْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ﴾ کو ﴿اُدْخُلِیْ جَنَّتِیْ﴾ پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ سو اس کی توجیہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے سمجھ میں آئی۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ جنت میں دوستوں کی زیارت اور ملاقات ہوگی اس وقت سے مجھے جنت کا اشتیاق ہوگیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دوستوں کی ملاقات میں جنت سے بھی زیادہ لذت ہے مگر شطرنج باز گنجفہ باز(۱) دوست نہیں بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جیسے دوست جو شافعی ہوں یا شافع ہوں۔ اور یا وعین دونوں جمع ہوجائیں تو نور علی نور ہے اور اگر ایسے دوست نہ ہوں بلکہ محض دنیوی دوستی ہو تو وہ آخرت میں مبدّل بعداوت(۲) ہوجائے گی۔

﴿اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ م بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ﴾(۳)

جنت میں باقی رہنے والی دوستی

وہاں وہی دوستی باقی رہے گی جس کا منشاء دین اور تقوی ہو۔ بہرحال دوستوں کی ملاقات میں ایسی لذت ہے کہ اس کے بغیر جنت بھی خار ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:

---

(۱) شطرنج کھیلنے والے گنجفہ کھیلنے والے دوست (۲) دوستی دشمنی سے بدل جائیگی (۳) سورۃ الزخرف: ۶۷۔

با تو دوزخ جنت است اے جاں فزا
بے تو جنت دوزخ است اے دلربا(۱)

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ
جنت است آن گرچہ باشد قعرِ چاہ (۲)

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں
فوق گردوں ست نے قعرِ زمیں (۳)

ایک صحابی کو یہ خیال ہوا کہ اگر جنت میں ہم نیچے کے درجے میں ہوئے اور حضور ﷺ اوپر کے درجوں میں ہوں اور اس لئے آپ کی زیارت نہ ہوئی تو جنت کو لے کر کیا کریں گے۔ انہوں نے حضور سے سوال کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾ (۴)

کہ ''جو لوگ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ رہیں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدّیقین اور شہداء صالحین کے ساتھ جنت میں ہوں گے اور یہ لوگ اچھے رفیق (اور اچھے دوست) ہیں''۔ ساتھ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ سب کے سب ان کے درجہ میں ہیں بلکہ

---

(۱) اے میرے محبوب تیرا ساتھ ہو تو میرے لئے دوزخ بھی جنت بن جائیگی اور تیرے بغیر تو جنت بھی دوزخ ہے (۲) جس جگہ یوسف علیہ السلام ہوں ان کا چہرہ چاند ہی کی طرح روشن ہوتا ہے وہ جگہ باغِ جنت ہے چاہے وہ کنویں کی تہہ اور گہرائی ہی کیوں نہ ہو (۳) جس جگہ میرا محبوب ہو وہی جگہ میرے لئے بیٹھنے کے قابل ہے وہ جگہ تو آسمانوں سے بھی بڑھ کر ہے نہ کہ زمین کی گہرائی (۴) سورۃ النساء: ۶۹۔

مطلب یہ ہے کہ ان کے قریب ہوں گے اور ان سے زیارت و ملاقات کیا کریں گے۔ کبھی ہم حضور ﷺ کی زیارت وملاقات کو جایا کریں گے۔ کبھی حضور ﷺ بھی ان شاء اللہ ہمارے پاس تشریف لایا کریں گے۔ اس وقت ہم خوش ہوکر یہ کہیں گے۔

امروز شاہِ شاہاں مہماں شدست مارا　　جبریل باملائک دربان شدست مارا(۱)

آگے ناز کو قطع کرتے ہیں کہ اپنے عمل پر ناز نہ کرنا ﴿ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ''(۲) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض فضل ہوگا۔ اس کے بعد فضل پر تکیہ کو توڑا(۳) ﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴾ کہ فضل پر تکیہ کرکے بےفکر نہ ہوجانا۔ اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ فضل کس پر ہوگا کس پر نہیں ہوگا۔ جس کو دوسرے مقام پر صراحت کے ساتھ بتلادیا گیا ہے: ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (۴)

اہتمامِ صحبت

تو مستورات کی درخواست کے بعد اول اس مضمون کے بیان کا ارادہ تھا۔ جس کا ذکر بھی اجمالاً کچھ ہوگیا۔ پھر دوسرے مضمون کا قصد ہوا مگر اس کا منتظر تھا کہ مجمع سمجھنے والا قدر دان ہو تو بیان کروں۔ پھر اتفاق سے ایسا مجمع بھی ہوگیا مگر مجھے تردد تھا کہ مستورات کے سامنے اسے بیان کروں یا نہیں مگر ایک تو مستورات کے اس قول سے کہ ہم تو دقیق مضامین بھی سمجھ لیتی ہیں کچھ ہمت ہوئی پھر خدا پر توکل اور بھروسہ کرکے بیان کا ارادہ کرہی لیا اور اس مرض کے متعلق بیان کرنا ہی

---

(۱) آج بادشاہوں کے بادشاہ (رسول اللہ ﷺ) میرے مہمان ہیں جبرئیل علیہ السلام فرشتوں سمیت میرے دربانی کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ (۲) یہ اللہ کا فضل ہے (۳) اگلی آیت میں یہ بتایا کہ فضل پر بھروسہ کرکے نہ بیٹھ جانا (۴) سورۃ الاعراب:۵۶۔

تجویز کرلیا جو کہ اکثر خواص میں ہے اور یہ جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ عوام کو بھی خواص سے مل کر یہ امراض لگ جاتے ہیں اس پر ایک علمی تحقیق یاد آگئی میں پہلے اس کو بیان کردینا چاہتا ہوں۔

علمی تحقیق

وہ یہ کہ امراضِ جسمانی میں تو تعدیہ نہیں ہوتا(۱) جس کے ڈاکٹر قائل ہیں گو شرعی حد میں رہ کر کوئی اس کا بھی قائل ہو تو گنجائش ہے۔ مثلاً کوئی عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مرض لگ جاتا ہے اگر حکم الٰہی نہ ہو تو نہیں لگ سکتا۔ اس میں زیادہ محذور نہیں (۲)۔ مگر بعض تو اس کے قائل ہیں کہ بدون مشیتِ حق (۳) کے مرض لگ جاتا ہے یہ لوگ دہریہ ہیں۔ یورپ کے ڈاکٹروں کا یہی عقیدہ ہے اور انہی کے اثر سے بعض مسلمانوں میں یہ عقیدہ آیا ہے مگر چونکہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمان بھی ایسے جن کے نام پر سر ہے (۴) جیسے سرکنڈے کا سر اور اگر شر کہو تو اور بھی اچھا کہ سر سے زیادہ شرف ہو جائے گا۔ تین نقطے تو بڑھ جائیں گے۔ اس لئے یہ لوگ اسلام کے نام کا لحاظ کرکے یوں کہتے ہیں کہ مرض لگتا تو ہے خدا ہی کے حکم سے مگر اللہ تعالیٰ نے جن امراض کو متعدی کیا ہے ان میں تعدیہ ضرور ہوگا۔ کیونکہ خدا نے یہ قاعدہ مقرر کردیا ہے کہ فلاں مرض ضروری ہی آلگے گا اور قانون فطرت بدل نہیں سکتا اس لئے مشیت بھی ضرور ہوگی اور تعدیہ بھی ضرور ہوگا۔ اور ان لوگوں

(۱) جسمانی بیماری ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی (۲) اس میں کوئی ڈر نہیں (۳) بغیر اللہ کے چاہے (۴) یعنی جن کے نام کے شروع میں ''سر'' کا لفظ لگا ہوا ہے یعنی وہ لوگ جن کو حکومت برطانیہ نے ''سر'' کا خطاب دیا تھا جیسے ''سر سکندر'' ''سر گنگارام'' وغیرہ۔

نے استدلال کیا ہے اس آیت سے۔﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا﴾(۱)

آپ خدا کے اس دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائیں گے اور خدا کے دستور کو کبھی منتقل ہوتا ہوا نہ پائیں گے۔

مگر یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عادت یا قانون کو کوئی دوسرا نہیں بدل سکتا نہ یہ کہ وہ خود بھی نہ بدل سکیں پس یہ کہنا غلط ہے کہ مشیت بھی ضرور ہوگی اور تعدیہ بھی ضرور ہوگا۔

امراضِ جسمانیہ میں لذت

پس تعدیہ میں تین قول ہوئے۔(۲) ایک یہ کہ بدون مشیت حق کے مرض لگتا ہے یہ تو کفر و زندقہ ہے۔

دوسرے یہ کہ مشیت حق سے لگتا ہے مگر مشیت تو ضرور ہوتی ہے یہ قول غلط و باطل ہے گو کفر نہیں۔

تیسرے یہ کہ مشیت سے لگتا ہے اور مشیت ضرور نہیں۔ اگر مشیت ہوگی تو مرض نہیں لگے گا۔ اس میں زیادہ محذور نہیں اگر کوئی اس کا قائل ہو جائے تو گنجائش ہے۔

مگر احادیث صحیحہ سے ظاہراً ترجیح اسی کو ہے کہ تعدیہ کوئی شے نہیں اور ایک کا مرض دوسرے کو نہیں لگتا۔

---

(۱) سورۃ فاطر:۴۳ (۲) ایک کا مرض دوسرے کو لگنے میں تین قول ہیں۔

((لا عدوی ولا طیرۃ)) ''مرض کے متعدی ہونے اور شکوہ لینے کی کوئی حقیقت نہیں'' حدیث مشہور ہے اسی طرح حدیث اعرابی میں ((فمن اعدی الاول)) ''یعنی پہلے میں کس سے تعدی ہوگی'' سے صاف عدوی کی نفی ہے [۱] اور یہ حدیث صحیح ہے۔

اخلاقِ باطنیہ میں تعدیہ

غرض امراض جسمانی میں تو صحیح قول یہ ہے کہ تعدیہ [۲] نہیں ہے مگر امراض باطنیہ میں تعدیہ ضرور ہوتا ہے [۳] صوفیاء نے اس کو مسارقہ [۴] سے تعبیر کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہر جلیس اپنے جلیس کے اخلاق وغیرہ کا اثر اس طرح قبول کرتا ہے کہ نہ اس کو خبر ہوتی ہے نہ دوسرے کو' صحبت بد کا بھی اثر ہوتا ہے اور صحبت نیک کا بھی۔ اسی لئے صوفیاء کو صحبت کا اہتمام سب سے زیادہ ہوتا ہے چنانچہ صحبتِ بد کے بارے میں ان کا ارشاد ہے ؂

تا توانی دور شو از یار بد یار بد بدتر بود از مار بد [۵]

اور صحبت نیک کے بارے میں فرماتے ہیں ؂

یک زمانہ صحبتت با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا [۶]

صحبت صالح کا اثر تو یہ ہے کہ مسارقت کے بعد مشارفت ہوئی ہے [۷] کہ دونوں انوار سے منور ہوجاتے ہیں اور صحبت بد کے اثر کا کچھ نام صوفیاء نے نہیں

---

(۱) اس میں صراحۃً اس بات کا رد ہے کہ مرض دوسرے کو لگتا ہے (۲) جسمانی مرض تو دوسرے کو نہیں لگتا (۳) باطنی مرض ایک کا دوسرے کو لگ جاتا ہے (۴) چوری سے تعبیر کیا (۵) جتنا ممکن ہو بُرے دوست سے دور رہو اس لئے کہ بُرا دوست بدترین سانپ سے بھی بُرا ہے (۶) اللہ والے کی ایک لحہ کی صحبت سو سالہ بے ریا عبادت سے بہتر ہے (۷) نیک صحبت کے بعد شرافت بڑھ جاتی ہے۔

لکھا مگر میں کہتا ہوں کہ وہاں مسارقت کے بعد مبارقت ہوتی ہے کہ دونوں طرف سے بجلی چمکتی ہے اور سوختن وافروختن (۱) کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ دونوں کا دین جل کر خاک سیاہ ہوجاتا ہے۔ اسی لئے ایک عارف صحبت صالح کی تاکید میں فرماتے ہیں ؎

جہد کن وبا مردم دانا بنشیں با صدق و صفا
یا باصنمِ لطیفِ رعنا بنشین باشرمِ و حیاء
زیں ہر دو گرت یکے میسر نشود از طالع خویش
اوقات مکن ضائع و تنہا بنشین دریاد خدا (۲)

مطلب یہ ہے کہ یا تو کسی عارف کے پاس صدق وخلوص سے رہو اگر یہ نہ ہوسکے تو اپنی بیوی کے پاس رہو۔

بیوی کی دلداری

مگر آج کل نوجوانوں کو بیوی سے تو جاڑہ (۳) چڑھتا ہے اگر ماں باپ کی لائی ہوئی دلہن ہے تو وہاں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ صاحب پنچوں کی بلا سر دھر لی گئی۔ (۴) کیا کریں دولہا کو پسند نہیں۔ گوشرافت تو یہ ہے کہ ماں باپ کی لائی ہوئی کی قدر اپنی لائی ہوئی سے زیادہ کی جائے تاکہ ماں باپ کو شرمندگی نہ ہو مگر زیادہ شکایت تو ان لوگوں کی ہے جو خود طلب و رغبت سے نکاح کرتے ہیں اور پھر بھی بیوی کے حقوق ضائع کرتے ہیں۔ ان کی قدر نہیں کرتے' رات

(۱) جلا کر خاک کردینے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے (۲) کوشش کر کے صدق وصفا کے ساتھ کسی عقلمند کی صحبت میں بیٹھو۔ یا پھر شرم وحیا کے ساتھ اپنی محبوب بیوی کے پاس بیٹھو اگر کسی نوجوان کو یہ دو باتیں میسر نہ ہوں تو پھر اپنے اوقات کو ضائع نہ کرے اور تنہائی میں بیٹھ کر خدا کی یاد میں مشغول ہو (۳) بیوی کے پاس بیٹھنا تو پسند نہیں (۴) بڑوں نے فیصلہ کر کے ایک مصیبت میرے سر ڈال دی۔

دن دوست احباب کی صحبت میں رہتے ہیں ان سے دل لگی مذاق اور فحش مذاق کیا جاتا ہے اور بیوی سے جس کے ساتھ ایسی باتیں کرنا جائز بھی ہے اور ثواب بھی سیدھے منہ بات بھی نہیں ہوتی وہاں منہ کو گوند لگ جاتا ہے اور کہنے کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم کو شرم آتی ہے ارے تم کو مردوں کو فحش مذاق کرتے ہوئے غیرت نہ آئی ڈوب مرو۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو نہ شیخ میسر ہو نہ دلبر رعنا یعنی بیوی بھی میسر نہ ہو خواہ اس واسطے کہ نکاح کا سامان نہیں یا اس واسطے کہ بیوی مرگئی ہے تو اس کو چاہیئے کہ یادِ خدا میں تنہا بیٹھے اور صحبت بد میں ہرگز نہ بیٹھے ورنہ دین کی خیر نہیں تو صوفیاء کے کلام سے معلوم ہوا کہ اخلاقِ باطنہ میں تعدیہ ہوتا ہے[1]۔

درجاتِ اتباع

اسی لئے میں نے کہا تھا کہ آج جس مرض پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں عوام اس سے بری ہیں۔ ہاں خواص سے مل کر کبھی ان میں بھی یہ مرض پیدا ہوجاتا ہے اس لئے سب کے سامنے اس کے بیان کردینے کا مضائقہ نہیں اور وہ مرض ایسا ہے جو ابھی پندرہ بیس دن ہوئے سمجھ میں آیا ہے۔ اس کی عمر بہت تھوڑی ہے اور جیسے اس کی سمجھ میں آنے سے مسرت ہوئی[1] کہ ایک نیا علم حاصل ہوا ویسے ہی اس کا غم بھی ہوا کہ اب تک اتنے روز تک ہم جہل میں مبتلا رہے اور اس کے سمجھ میں آنے کے بعد میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں نے اپنی اصلاح کرلی ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ میں اپنی حالت کو نظر ثانی کا محتاج سمجھنے لگا۔ اور امید ہے کہ ان شاء اللہ دس پندرہ روز میں نظر ثانی ہوجائے گی اور میں اپنے احباب کو بھی اسی کی وصیت کرتا ہوں کہ آپ

(۱) باطنی اخلاق ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں (۲) خوشی ہوئی۔

بھی اس کو سن کر اپنی حالت پر نظر ثانی کیجئے۔

وہ مضمون یہ ہے کہ وہ شخص جس کو طریق کی طلب ہے یہ چاہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا متبع ہو جاؤں پھر اتباع کے دو درجے ہیں:

ایک یہ کہ فتویٰ علماء پر عمل کرتا رہے۔ جس کو وہ جائز کہیں اس کو جائز جانے اور جس کو وہ ناجائز اور حرام کہیں اس سے بچے۔ یہ بھی ایک درجہ اتباع کا ہے کہ مباحات شرعیہ(۱) پر عمل کرے۔ گو حضور ﷺ نے ان مباحات کو نہ کیا ہو اور یہ بھی نجات کے لئے کافی ہے۔ میں غلو نہیں چاہتا گو یہ مضمون میری نظر میں بہت اہم ہے جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اور ایسا اہم ہے کہ میں اس کی بنا پر اپنی حالت کو نظر ثانی کا محتاج سمجھتا ہوں۔ مگر میں حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہتا کہ مباحات پر عمل کرنے کو ناکافی کہہ دوں، ہرگز نہیں! بلکہ میں صاف کہتا ہوں کہ مباحات پر عمل کرنا بھی اتباع میں داخل اور نجات کے لئے کافی ہے۔

دوسرا درجہ اتباع کا یہ ہے کہ حضور ﷺ کی عادات و افعال کا اتباع کیا جائے۔ یہ کامل اتباع ہے اور اس کے لئے ضرورت ہے حضور ﷺ کے اخلاق وعادات وافعال وطریق عمل کے معلوم کرنے کی پھر اس میں بھی تین درجے ہیں۔ ایک عبادات میں اتباع، دوسرے معاملات میں اتباع، ان میں تو جہاں تک ہو سکے حضور ﷺ کے طرز عمل کا اتباع کرے۔ اور حضور ﷺ کے طریق عمل کی تلاش کرے کیونکہ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور مخلوق سے ہے اور ایک یہ کہ ماکولات و مشروبات (۲) میں اتباع کیا جائے کہ جو حضور ﷺ نے کھایا وہی کھائے، جو حضور ﷺ نے پیا وہی پیئے، جو آپ نے پہنا وہی پہنے، اس میں جس

(۱) شریعت نے جن چیزوں کو جائز قرار دیا ہے ان پر عمل کرے (۲) کھانے اور پینے کی چیزوں میں وہ کھائے پیئے جو حضور ﷺ نے کھایا پیا ہو۔

قدر سہولت ہو سکے اتباع کیا جائے مبالغہ نہ کیا جائے کیونکہ اس میں مبالغہ کرنا بعض اوقات ہم جیسے ضعفاء (۱) کے تحمل سے باہر ہوتا ہے اور یہ اقویاء کا کام ہے (۲)۔

خواجہ بہاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق

جیسے حضرت خواجہ بہاؤالدین کی یہی تحقیق ہے۔ جس کا قصہ یہ ہے کہ آپ کی مجلس میں حدیث پڑھی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہ کھاتے تھے بلکہ آٹے کو پیس کر پھونک سے بھوسا اڑا دیا جاتا تھا۔ جو اڑ گیا وہ اڑ گیا باقی کو گوندھ کر پکا لیا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آج سے ہمارے واسطے بھی اسی طرح آٹا گوندھا جائے اور چھلنی میں نہ چھانا جائے شام کو جو روٹی اس طرح کھائی گئی سب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ ہم نے بڑی گستاخی کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات (۲) کا قصد کیا اور اپنے کو اس سنت پر عمل کرنے کا اہل سمجھا ہم اس کے اہل نہ تھے اس لئے تکلیف ہوئی۔ آئندہ سے ہمارے واسطے چھنا ہوا آٹا ہی بدستور پکایا جائے۔

سبحان اللہ کیسا ادب تھا کوئی بے ادب ہوتا تو سنت پر اعتراض کرتا کہ اچھا سنت پر عمل کیا تھا عمل بالسنّت سے یہ ضرر ہوا (۳) مگر حضرت شیخ نے ہم جیسوں کی تعلیم فرمادی کہ ہم اس سنت کے اہل نہ تھے کیونکہ ہمارے قویٰ ضعیف ہیں (۴) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قویٰ ہم سے زیادہ قوی (۵) تھے اس لئے۔ یہ طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے واسطے مناسب تھا۔

---

(۱) کمزوروں کی برداشت سے باہر ہو جاتا ہے (۲) یہ قوی الہمت لوگوں کا کام ہے (۲) برابری کا ارادہ کیا (۳) سنت پر عمل کرنے سے یہ نقصان ہوا (۴) ہمارے اعضاء کمزور ہیں (۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعصاب ہم سے زیادہ مضبوط تھے۔

غرض ماکولات و مشروبات و ملبوسات[۱] میں اگر ہوسکے تو جتنا بھی ہوسکے اتباع کرے جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے کدو رغبت سے کھایا ہے اسی طرح آپ کو دست کا گوشت مرغوب تھا[۲] اور ٹھنڈا اور میٹھا پانی مرغوب تھا۔ وغیرہ وغیرہ لیکن اس میں اپنی ہمت سے آگے غلو نہ کیا جائے۔ زیادہ اہتمام اور کاوش کی ضرورت ان امور میں ہے جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے یا مخلوق سے یعنی عبادات و معاملات، اور ماکول ومشروب کا تعلق تو اپنی ذات سے ہے اس میں بہت کاوش کی ضرورت نہیں۔ ہاں سہولت سے جتنا ہو جائے یہ بھی دولت عظیمہ ہے۔ مگر آج کل برعکس معاملہ ہے کہ ماکولات و مشروبات و ملبوس میں تو اتباعِ نبوی کاوش[۳] کے ساتھ کیا جاتا ہے عبادات اور معاملات میں اتباع کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔

اتباعِ سنت

تو اب میں اس مرض کے متعلق کہتا ہوں کہ ہم لوگ جو حضور ﷺ کا اتباع کرتے ہیں تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ اتباع تو کرتے ہیں اپنی طبیعت کا اور بوجہ علم کے اس کے دلائل احادیث سے تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ اپنی طبیعت سے خالی الذہن ہوکر حضور ﷺ کے طرز کو اصل بنائیں پھر اس کا اتباع کریں۔ میں دوسروں کو کیا کہوں۔ خود اپنے کو کہتا ہوں مثلاً میرے اندر تیزی ہے تو میں عمل تو کرتا ہوں اپنی طبعی حدت پر[۴] مگر اس کی تائید میں حدیثیں میں نے وہ تلاش کر لیں ہیں جن میں حضور ﷺ سے غصہ کرنا ثابت ہے۔ مثلاً حدیث لقطہ[۵] میں آپ ﷺ

(۱) کھانے، پینے، پہنے میں جتنی مشابہت ہوسکے اختیار کرے (۲) بازو کا گوشت پسند تھا (۳) کوشش کے ساتھ (۴) طبیعت کی تیزی پر (۵) وہ حدیث جس میں گم شدہ چیز کے بارے میں آپ نے حکم بیان کیا۔

نے سائل کے اس قول پر کہ لقطۂ ابل (۱) کو کیا کیا جائے' غصہ ظاہر فرمایا۔ اسی طرح دیوار قبلہ پر نخامہ (رینٹ) دیکھ کر آپ ﷺ کو غصہ آ گیا۔ نیز صحابہ رضی اللہ عنہم نے مسئلہ قدر میں کلام کیا تو حضور ﷺ کو سخت ناگوار ہوا اور آپ ﷺ بہت غصے ہوئے۔

میں ابھی آپ کو اپنے سے بدگمان نہیں کرتا کیونکہ بلاوجہ اپنے کو متہم کرنا بھی بُرا ہے۔ میں نے محض مثال دی ہے کہ ممکن ہے میری یہ تیزی اتباع سنت کی بنا پر نہ ہو۔ بلکہ اتباع طبیعت پر مبنی ہو اور سنت کو محض آڑ بنالیا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اتباع سنت ہی کی وجہ سے ہو۔ کیا عجب ہے کہ نظر ثانی میں یہ حالت سنت کے موافق ہی نکلے مگر جس کو اتباع سنت کا قصد و اہتمام ہے اس کو احتمال ضرور ہونا چاہیئے کہ میری حالت حقیقت میں اتباع سنت کے موافق ہے یا سنت کو محض آڑ بنایا گیا ہے کیونکہ آج کل زیادہ تر اتباع سنت اسی طرح ہورہا ہے کہ اتباع تو کرتے ہیں اپنی طبیعت کے تقاضے کا۔ طبیعت کو بدلنا اور اس پر مشقت ڈالنا بالکل نہیں چاہتے اور اس کی تائید میں علم و حفظ کی مدد سے بہت سی احادیث چھانٹ لی ہیں۔

اتباعِ سنت میں لوگوں کا حال

مثلاً کسی کو عمدہ غذا کا شوق ہے اس نے یہ حدیث چھانٹ لی کہ حضور ﷺ نے عمدہ کھانا کھایا ہے۔ چنانچہ ایک فارسی نے ایک مرتبہ آپ کی دعوت کی تھی اور عمدہ گوشت پکایا تھا۔ کسی کو عمدہ لباس کا شوق ہے اس نے وہ حدیث یاد کرلی کہ حضور ﷺ کی خدمت میں کسی بادشاہ نے ایک جبہ ہدیہ کیا تھا جس کی آستین وغیرہ میں ریشم کی گوٹ تھی اور آپ نے وہ جبہ زیب تن فرمایا تھا۔ کسی کو رؤسا کی خوشامد کی عادت ہے اس نے تالیف قلوب کے واقعات یاد کرلئے کسی میں بخل ہے اس نے یہ

(۱) کسی کو گمشدہ اونٹ ملے تو کیا کرے۔

حدیث یاد کرلی کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ کچھ مال تقسیم فرمایا اور ایک شخص کو نہ دیا جس پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔((یا رسول الله انی اراه مومنا فقال او مسلما)) اسی طرح ایک شخص لنگی پہنتا ہے وہ لبس ازار کی حدیث یاد کئے ہوئے ہے۔ دوسرا پاجامہ پہنتا ہے وہ احادیث ازار میں تاویل کرتا ہے۔ اب یہ سب احادیث کتابوں میں موجود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ حضور سے یہ سب افعال صادر ہوئے ہیں مگر ان کو یاد کر لینے کا نام اتباع سنت نہیں۔

دیکھو! ایک باغ میں پھل بہت قسم کے ہیں۔ ایک درخت انار کا بھی ہے ایک درخت امرود کا بھی ہے۔ ایک دو ناشپاتی کے بھی ہیں مگر یہ بتاؤ کہ اس کو کس چیز کا باغ کہا جائے گا۔ یقیناً جس پھل کا غلبہ ہوگا اور جو پھل زیادہ ہوگا اسی کا باغ کہلائے گا۔ اگر آم زیادہ ہیں تو اس کو آم کا باغ کہیں گے ایک امرود کے درخت سے اس کو امرود کا باغ کوئی نہ کہے گا۔

اتباعِ سنت کی حقیقت

اسی طرح یہاں سمجھو کہ حضور ﷺ کے واقعات تو بہت ہیں ہر قسم کے واقعات آپ کو احادیث میں مل جائیں گے مگر اس سے آپ کا طرز ثابت نہیں ہوسکتا۔ آپ کی طرز و عادت وہ ہے جو غالب و مستمر ہو(۱)۔ پس غالب حالت اور دائمی حالت کو دیکھو اور اس کا اتباع کرو۔ یہ اتباع حقیقی ہوگا اتفاقی واقعات کے اتباع کا نام اتباعِ سنت نہیں پھر علماء کو تو علم سے اس کا پتہ چلے گا کہ غالب حالت حضور ﷺ کی کیا تھی اور عوام کو چاہیئے کہ کتب واقعات و سیرت کا مطالعہ کر کے دیکھیں کہ غالب واقعات کس قسم کے ہیں۔ جو غالب عادت ہو اس کو اصل قرار دو اور دوسرے کو عارض پر محمول کرو۔

(۱) جو طریقہ آپ نے ہمیشہ اختیار کیا ہو یا اکثر اختیار کیا ہو۔

عمل اور مقصودیت

مگر یہاں ایک بات اہل علم کے سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ صورۃً عمل قلیل ہوتا ہے مگر معناً کثیر وغالب ہوتا ہے۔ جیسے تراویح میں عمل تین رات ہوا ہے اور خشیت افتراض (۱) کی وجہ سے ترک زیادہ ہوا لیکن یہ ترک عارض سے تھا اور عمل اصل، پس اسی کو راجح کہیں گے اور تراویح کو سنت کہیں گے۔

یہاں سے غیر مقلدوں کا جواب ہوگیا جو کہ تراویح کی آٹھ رکعت پڑھتے ہیں اور بیس کو یہ دعویٰ کر کے بدعت کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے بیس نہیں پڑھیں سو اول تو یہی متکلم فیہ (۲) ہے کہ بیس کا ثبوت نہیں لیکن بعد تسلیم کے ہم کہتے ہیں کہ جس طرح حضور ﷺ نے بیس رکعت نہیں پڑھیں اسی طرح آپ نے تراویح تین دن سے زائد نہیں پڑھیں۔ پس تم بھی عمر بھر میں تین دن سے زائد نہ پڑھو کیونکہ حدیث میں زائد کا ثبوت نہیں۔ اس لئے یہ بدعت ہے پس جس دلیل سے تم استمرار عمل کا بدعت نہ ہونا ثابت کرو گے اور وہ عمل ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کا، اسی دلیل سے ہم بیس رکعت کا بھی بدعت نہ ہونا ثابت کر دیں گے۔

حضور ﷺ کی عادت غالبہ معلوم کرنے کا معیار

خلاصہ یہ کہ عادت غالبہ معلوم کرنے کا مدار صرف کثرت عمل پر نہیں ہے بلکہ کبھی عادت کا غالب ہونا کثرت وقوع عمل سے معلوم ہوتا ہے اور کبھی غلبہ مقصودیت سے معلوم ہوتا ہے اور اس کے لئے تراویح کی نظیر کافی ہے کیونکہ یہاں وقوع کے اعتبار سے تو عمل قلیل ہے مگر مقصودیت کے اعتبار سے غالب ہے پس

(۱) تراویح صرف تین دن پڑھی اور فرض ہونے کے خوف سے جماعت تراویح کا ترک زیادہ دن ہوا (۲) اسی میں بحث ہے۔

یہاں عمل کی قلت و کثرت پر مدار نہ ہوگا۔

اسی طرح رفع یدین و عدم رفع میں فقہاء نے کثرت عمل وقلت عمل کونہیں دیکھا بلکہ مقصودیت پر نظر کی ہے۔بعض نے رفع کو مقصود سمجھا کیونکہ نماز فعل وجودی ہے اور رفع بھی وجودی ہے تو دونوں میں تناسب ہے ۔ اور بعض نے عدم رفع کو مقصود سمجھا کیونکہ نماز کا مبنی سکون پر ہے۔ حدیث مسلم میں ہے((اسکنوا فی الصلوۃ)) (نماز میں سکون سے رہو) اور تکرار رفع سکون کے منافی ہے(۱) اور کہیں کثرت و مقصودیت دونوں جمع ہو جاتے ہیں جیسے منبر سے نیچے نماز پڑھنا کہ ''صلوۃ تحت المنبر '' عملاً بھی کثیر ہے''صلوۃ فوق المنبر '' کا وقوع قلیل ہے اور مقصودیت بھی''تحت المنبر '' میں ہے اور زیادہ تر ایسا ہی ہے کہ جو عمل وقوع میں کثیر ہوتا ہے مقصودیت بھی اس میں غالب ہے مگر بعض دفعہ اس کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ اس لئے حضور ﷺ کے طرز عمل سے آپ کی عادت وسنت کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں بلکہ محقق کا کام ہے۔

یہ بات قابل تحقیق و تدقیق ہے کہ مقصودیت کہاں ہے کہاں نہیں اس لئے کسی بزرگ کے عمل کو رسول اللہ ﷺ کے عمل کثیر کے خلاف اور عمل قلیل کے موافق دیکھ کر ان پر اعتراض نہ کرنا چاہیئے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ممکن ہے ان کے نزدیک عمل قلیل ہی میں مقصودیت ہو۔

بزرگوں پر اعتراض سے احتراز

مثلاً شاہ فضل الرحمٰن صاحب میں تیزی غالب تھی اور یہ بات حضور ﷺ کی عادت غالبہ کے بظاہر خلاف ہے تو اپنے کو تو تم متہم سمجھو اگر تمہارے اندر ایسا ہو مگر بزرگوں پر اعتراض نہ کرو بلکہ یا تاویل کرو کہ حضور ﷺ کی تیزی مقتضاء کی وجہ سے

(۱) نماز میں بار بار رفع یدین کرنا نماز میں سکون اختیار کرنے والی حدیث کے خلاف ہے۔

تھی یعنی معتوب کی بیہودگی کی وجہ سے اور اس وقت بوجہ سلامت طباع کے اس مقتضاء کا وجود کم تھا۔اس لئے تیزی کا وقوع بھی آپ سے کم ہوا۔(اگر حضور ﷺ کے زمانہ میں بھی مقتضاء کا وجود زیادہ ہوتا تو آپ کی تیزی کا وقوع بھی زیادہ ہوتا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام میں ہوا) اور اب مقتضاء زیادہ ہے اس لئے شاہ صاحب میں اس کا ظہور زیادہ ہوا۔

غرض اس طریق میں چین و اطمینان اور بے فکری جائز نہیں۔ چنانچہ اتباعِ سنت کی حقیقت عادت غالبہ کا اتباع بتلایا گیا تھا۔اب عادت غالبہ کی تحقیق میں خدشہ پیدا ہوگیا کہ اس کا مدار بھی محض کثرت عمل پر نہیں رہا۔اب قدم قدم پر غور وفکر کی ضرورت ہے کہ کہاں عمل غالب ہے مع مقصودیت کے اور کہاں مقصودیت غالب ہے بدون عمل کے۔اور پھر چین اور بے فکری کہاں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گہہ چنیں بنماید و گہہ ضدایں جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

اور فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش تادم آخر دمے فارغ مباش

''راہ سلوک میں بہت تراش خراش ہیں لہذا آخر دم تک ایک دم کے لئے فارغ نہ ہو بلکہ کام میں لگے رہو''۔

تادم آخر دمے آخر بود کہ عنایت باتو صاحب سر بود (۱)

ضرورتِ طلب

پس یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ عمر بھر بے چین رہو اور فکر میں لگے

(۱) آخر دم تک کام میں لگے رہو شاید تم پر آخر وقت مین اللہ کی عنایت متوجہ ہوجائے۔

رہو اپنی حالت کو اچھا نہ سمجھو بلکہ متہم سمجھو۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا الحزم سوء الظن کی تفسیر میں ارشاد ہے کہ ہوشیار وہ ہے جو کہ اپنے نفس سے بدگمان رہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ جس کو تمام عمر کام کر کے ساری عمر میں یہ بات حاصل ہو جائے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا اس کو سب کچھ حاصل ہو گیا۔

مبارک ہے وہ شخص جو عمر بھر اسی ادھیڑ بن میں لگا رہے کہ میری حالت اچھی ہے یا بُری۔

صاحبو! طلب ہی مطلوب ہے' تمہارا یہی کام ہے۔ پس تم عمر بھر طلب ہی میں رہو۔ یہ بات میں نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہے کہ طلب مطلوب ہے وصول مطلوب نہیں کیونکہ وہ تمہارے قبضہ میں نہیں۔ پس تم کسی وقت اپنے کو فارغ نہ سمجھو۔ جس نے اپنے کو فارغ و کامل سمجھ لیا اور اپنی حالت پر مطمئن اور بے فکر ہو گیا وہ برباد ہو گیا' سن لو خوب غور سے سن لو! اطمینان تو اللہ نے چاہا جنت ہی میں ہوگا یہاں اطمینان کہاں؟ ہمیشہ اپنے کو متہم سمجھو۔ کبھی اپنی حالت پر اطمینان نہ کرو اور ہر وقت طلب میں لگے رہو' پھر کیا ہوگا ؎

ہر کجا دردے دوا آں جا رود ہر کجا رنجے شفا آں جا رود

''جہاں درد ہوتا ہے دوا کی وہیں ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں بیماری ہوتی ہے شفا وہیں جاتی ہے''۔

ہر کجا پستی ست آب آں جا رود ہر کجا مشکل جواب آں جا رود

''پانی ڈھلوان ہی کی طرف جاتا ہے جب کوئی مشکل پیش آئی ہے تو حل کی وہیں ضرورت ہوتی ہے''۔

اپنے اندر طلب کی پیاس پیدا کرو ابرِ رحمت کی بارش ہونے لگے گی اپنے کو عاجز و فانی سمجھو۔ حق تعالیٰ تم کو قوت و ہمت عطا فرمائیں گے ۔

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں رایک زمانے خاک باش

''برسوں تو سخت قسم کا پتھر بنا رہا آزمائش کے لئے چند روز کے لئے خاک بن''۔ جا خاک ہونے سے کیا ہوگا۔

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

''موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتا ہے۔ خاک ہوجاتا کہ رنگ برنگ کے پھول کھلیں''۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نیگرد فضل شاہ

''عقل اور سمجھ کو تیز کر لینا راہِ سلوک نہیں حق تعالیٰ اس کی دست گیری کرتا ہے جو شکستگی اختیار کرتا ہے''۔

شکستگی اور بندگی و بیچارگی اختیار کرو اپنے اعمال واحوال پر ناز نہ کرو ۔

پیش یوسف نازش و خوبی مکن جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

ناز را روئے بباید ہمچو ورد

چوں نداری گرد بد خوئے مگرد

عیب باشد چشم نابینا و باز زشت باشد روئے نازیبا و ناز

چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش

ہمچو اوبا گریہ و آشوب باش

''یوسف علیہ السلام کے سامنے ناز مت کرو سوائے آہ و نیاز یعقوب کے کچھ

مت کرؔ، نازواداکے لئے حسین چہرہ چاہئے، جب تم حسن نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس مت جاؤ۔جس طرح نابینا آنکھ کے لئے کھلا ہوا ہونا بُرا ہے اسی طرح نازیبا شکل کے لئے ناز بُرا ہے۔جب تم یوسف نہیں ہو یعقوب ہی رہو اوران کی طرح گریہ وآشوب میں رہو''۔

مگر یہ جو میں نے کہا ہے کہ اپنے کو متہم نہ سمجھو کبھی اپنے حال پر اطمینان نہ کرو اس کی سرحد ناشکری سے ملی ہوئی ہے۔اس لئے اس کے ساتھ یہ بھی سمجھے کہ اس وقت جو کچھ بھی میری حالت ہے جیسی کچھ بھی ہے یہ سب خدا کا فضل ہے۔

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے

''اگر اتنا بھی نہ ہوتا تو مصیبت ہوجاتی'' اسی کو مولانا فرماتے ہیں کہ اس طریق میں بحر تلخ و بحر شریں ساتھ ساتھ ہیں مگر محقق اس برزخ سے واقف ہوتا ہے جو دونوں کو کبھی ملنے نہیں دیتا۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں درمیاں شاں برزخ لا یبغیاں (۱)

پھر بتلائیے یہاں بے فکری اور اطمینان کہاں؟ یہاں تو بہت پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

نیک خاتون کے ذکر کی برکت

چنانچہ میں جس معمر بی بی کی فرمائش پر اس وقت بیان کررہا ہوں انہوں نے ایک رات ہمارے یہاں بھی کرم فرمایا تھا۔جب رات کے دو بجے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور ادعیہ ماثورہ آواز کے ساتھ پڑھنے لگیں۔میری آنکھ کھل گئی اور مجھ کو شرم آئی کہ ایک اللہ کی بندی تو ذکر اللہ میں مشغول ہے اور میں پڑا سورہا ہوں

(۱) شور شیریں دونوں دریا ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اوران کے درمیان مثل برزخ کے فاصلہ ہے جو ایک کو دوسرے سے ملنے نہیں دیتا۔

مگر اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ بہت سویرا تھا۔ میرے نفس نے کہا ابھی سو رہو اور یہ تاویل کی کہ ''نوم العالم عبادۃ'' کہ عالم کا سونا عبادت ہے مگر ان کی برکت نے مجھے حرکت پر مجبور کیا اور دل نے کہا ؎

خواب را بگذار امشب اے پسر　　یک شبے در کوئے بے خواباں گذر (۱)

ان بے خوابوں کی کیا حالت ہے؟ ان کی یہ حالت ہے ؎

چہ خوش وقتے و خرم روز گارے　　کہ یارے برخورداز وصل یارے (۲)

اور یہ حالت ہے ؎

بفراغِ دل زمانے نظرے بماہ روئے　　بہ زاں کہ چترِ شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے (۳)

اور یہ حالت ہے کہ ؎

دل آرامے کہ داری دلِ درد بند　　وگر چشم ازہمہ عالم فروبند

اور وہ اس وقت یوں کہتے ہیں ؎

ہمہ شہر پرز خوباں منم و خیال ما ہے
چہ کنم کہ چشم بد خونکند بکس نگاہے

''سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے مگر میں کہ ایک چاند کے خیال میں مست ہوں۔ کیا کروں کہ یہ آنکھ ایک کے سوا کسی کی طرف دیکھتی ہی نہیں ہے''۔

---

(۱) سونے کی عادت کو ترک کر اے رات کو سونے والے اور ایک رات شب بیداروں کی محفل میں گذار

(۲) کتنا اچھا وقت ہے اور کیا عمدہ دن ہے کہ آج محبوب خود ملنے کو آیا ہے (۳) تیرا چاند سا چہرہ دیکھنے کو اور اس کیطرف متوجہ ہونے کو میں نے دل زمانے کی افکار سے فارغ کرلیا ہے اس لئے کہ چتر شاہی میں تو شورو شغب ہوتا ہے۔

نواب شیفتہ نے اس وقت کا فوٹو خوب کھینچا ہے فرماتے ہیں۔

چہ خوش ست باتو بزمے بنہفتہ ساز کردن　　در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن (۱)

اے اللہ! (بکی الشیخ وولول وصاح واضطرب ۱۲ اظ(۲) پھر میں کھڑا ہوگیا اور کچھ کام کرلیا پھر سوگیا مگر جب بھی آنکھ کھلی اُن کو کام میں مشغول پایا اور ذکر کی آواز آتی رہی۔

شانِ محقق

اس وقت مجھے خیال ہوا کہ صبح کے وقت ان کو متنبہ کروں گا کہ رات کے وقت جہر بالذکر مناسب نہیں کیونکہ اس میں نائم کی تشویش ہے اور فقہاء نے اس سے منع فرمایا ہے۔مگر اس خیال کے ساتھ ہی جواب ذہن میں آیا اور غالبًا وہ بھی یہی جواب دیتیں کہ حضور ﷺ ایک بار تفقد احوال صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے رات کو اٹھے۔(۳) پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آہستہ آہستہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ زور زور سے بلند آواز کے ساتھ قرآن مجید پڑھ رہے ہیں۔صبح ہوئی اور حضور ﷺ نے سب سے فرمایا کہ تم ایسا کیوں کررہے تھے اور فرمایا کہ اے ابوبکر رضی اللہ عنہ تم کسی قدر اپنی آواز کو اونچا کردو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم اپنی آواز کو ذرا پست کرو۔ نیز جماعت اشعریین کی حضور ﷺ نے تعریف فرمائی کہ مجھے ان کے منازل کا علم ان کی آواز سے ہوجاتا ہے جب کہ رات کو وہ قرآن پڑھتے ہیں اور آیت ﴿و تقلبك فی السجدین﴾ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ آپ رات کو اپنے اصحاب کا تفقد فرماتے تھے اور اس وقت آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کی آواز سے ان کے عمل کو معلوم فرماتے تھے۔

---

(۱) تیرے آنے سے میری بزم کتنی عمدہ ہوگئی میں نے گھر کے دروازے بند کردیئے اور اپنی آنکھوں کے در کھول دیے تاکہ تجھے دیکھتا رہوں (۲) مذکورہ بالا اشعار پڑھ کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ رو پڑے اور مضطرب ہوگئے پھر جب طبیعت میں سکون ہوا تو آگے بیان شروع کیا۔(۳) صحابہؓ کا حال معلوم کرنے کے لئے رات کو نکلے۔

اب بتلایئے میں اس ادھیڑ بن کو کیا کروں کہ پہلے ایک خیال آیا اور ساتھ ہی اس کا جواب بھی ذہن میں آ گیا۔ تو میں خاموش ہو گیا مگر چونکہ اس حدیث میں اور فقہاء کے فتویٰ میں بظاہر تعارض ہوا اس لئے پھر فکر میں لگ گیا چنانچہ پھر اس تعارض کو اس طرح رفع کیا کہ سونے والے دو قسم کے ہیں ایک وہ جو تہجد کے لئے جاگنا چاہیں دوسرے وہ جو جاگنا نہ چاہیں۔ جو جاگنا چاہیں ان کے پاس ذکر بالجہر کی اجازت ہے چنانچہ ہم نے خانقاہ میں رات کو دو بجے کے بعد ذکر بالجہر کی اجازت دے رکھی ہے کیونکہ وہ سب جاگنا چاہتے ہیں اور جو جاگنا نہ چاہے اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ خانقاہ میں تمہاری رعایت نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ سونے والوں کی جگہ نہیں اور جو لوگ سونا چاہیں ان کے پاس بیٹھ کر ذکر جہر ممنوع ہے تا کہ ان کی نیند میں خلل نہ آئے۔

ذکر بالجہر کا حکم

اب اسی مسئلہ میں دیکھئے کہ فقہاء کا فتوی تو یہ تھا کہ سونے والوں کے پاس ذکر جہر مکروہ ہے مگر احادیث میں ایسے واقعات ملے جن سے رات کے وقت ذکر جہر کا نائمین کے پاس ثبوت ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں یہ تھا ((کنت اطرد الشیطان واوقظ الوسنان)) کہ میں بلند آواز اس لئے کر رہا تھا کہ شیطان کو بھگاتا اور سونے والوں کو جگاتا تھا۔ ایسے موقع میں غلبہ مقصودیت سے فیصلہ کیا جائے گا۔ اور دلائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ میں نائمین کے پاس رفع صوت بالذکر عارض عادی تھے اور اصل مقصود عدم رفع ہے۔

پس اب ان بڑی بی کے عمل کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ جہاں مہمان ہوا کریں

گھر والوں سے پوچھ لیا کریں۔ اور عدم رفع صوت عندالنائم (۱) کی مقصودیت کی دلیل میں حضرت عائشہؓ کی حدیث مجھے یاد آئی کہ باوجودیکہ حضرت عائشہؓ رسول اللہ ﷺ کی عاشق تھیں کہ حضور ﷺ کے کسی فعل سے ان کو تکلیف نہ ہوسکتی تھی مگر حضور ﷺ ان کے سوتے ہوئے ان کے پاس ہر کام آہستہ سے کرتے تھے۔

حضور ﷺ کی شانِ محبوبیت

حالانکہ وہ ایسی عاشق تھیں کہ فرماتی ہیں۔

لواحی زلیخاء لورأین جبینہ
لاثرن بالقطع القلوب علی الید

''زلیخا کی ہمجولیاں اگر میرے محبوب کی پیشانی دیکھ لیتیں تو یہ ان کے دل و جگر کے ٹکڑے کردیتیں''۔

کسی شاعر نے حضرت زلیخا کے قول هذا الذی لمتننی فیه کا ترجمہ خوب کیا ہے۔

ایں ست کہ خوں خوردہ و دلبردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظرے ہست کسے را(۲)

زلیخا نے زنانِ مصر سے ان کی ملامت کے جواب میں کہا تھا کہ لو دیکھ لو میرا محبوب یہ ہے جسے دیکھ کر تم نے مبہوت ہوکر بجائے نارنگی کے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ عورتیں اگر حضور ﷺ کو دیکھ لیتیں تو اپنے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کردیتیں۔ ہمارے حضور ﷺ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن میں فرق یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کے حسن کا رعب اول وہلہ میں زیادہ ہوتا تھا کہ تحمل نہ ہوسکتا تھا پھر رفتہ رفتہ تحمل ہوجاتا تھا۔ جیسا کہ حضرت زلیخا کو تحمل

(۱) سونے والے کے پاس بلند آواز سے ذکر نہ کرنا (۲)۔۔۔۔۔

ہو گیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن کا اول وہلہ میں تحمل ہو جاتا مگر جوں جوں غور کیا جاتا دل قابو سے نکلا جاتا اور تحمل دشوار ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ پر مرد بھی عاشق تھے اور بچے بھی عاشق تھے اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیسی کیسی جانبازی اور جانثاری سے آپ کے عشق میں جان دی ہے۔ غرض حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے انتہا عاشق تھیں۔ پھر ایسے عاشق کو آپ کی آواز یا آہٹ سے تکلیف کہاں ہو سکتی تھی اور ہوتی بھی تو یوں کہتیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

''تیری وہ باتیں جو بظاہر ناگواری کی ہوتی ہیں میرے لئے وہ باعث راحت ہیں اور تجھ جیسے ستانے والے پر دل و جان سے قربان ہوں''۔

مگر حدیث میں ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل بقیع کے واسطے دعا کا حکم ہوا تو آپ آدھی رات کے قریب اٹھے اور آہستہ سے جوتا پہنا اور آہستہ سے کواڑ کھولے اور آہستہ سے چلے۔ غرض ہر کام آہستہ سے کیا تا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آنکھ نہ کھل جائے کہ آنکھ کھلنے سے خود بھی اذیت ہوتی ہے اور تنہائی سے بھی وحشت ہوتی ہے آپ کی روانگی کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آنکھ کھلی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا تو پریشان ہو گئیں۔

باسایہ ترا نمی پسندم   عشق است و ہزار بدگمانی (۱)

یہ وسوسہ ہوا کہ شاید آپ کسی دوسری بیوی کے پاس تشریف لے گئے ہیں پھر عاشق کو یہ کہاں گوارا کہ محبوب رقیب کے پاس جائے۔ وہ تو رقیب کے لئے محبوب کے ہاتھ سے تکلیف کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ ایسی تکلیف بھی اپنے ہی لئے چاہتا ہے اور یوں کہتا ہے ؎

(۱) مجھے تجھ سے عشق ہے اس لئے تیرے سائے کو تیرے ساتھ دیکھ کر بھی مجھے بدگمانی ہو جاتی ہے۔

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

''آپ کی تلوار سے ہلاک ہونا خدا کرے دشمن کے نصیب میں نہ ہو دوستوں کا سر سلامت ہے جب چاہیں خنجر آزمائی کرلیں''۔

اور حضور ﷺ کی محبوبیت تو ایسی تھی کہ جانور تک آپ کے عاشق تھے حدیث میں ہے کہ جس وقت حضور ﷺ نے حج وداع کیا ہے تو اپنی طرف سے سو اونٹوں کی قربانی کی۔جن میں تریسٹھ اونٹ خود اپنے دست مبارک سے نحر فرمائے حدیث میں ہے ((کلهن یزد لفن الیه)) کہ سب کے سب حضور ﷺ کے برچھے کی طرف بڑھتے اور گردن آگے کرتے تھے کہ پہلے مجھے نحر کیجئے اس وقت یہ شعر صادق آرہا تھا۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

''جنگل کے تمام ہرن اپنے سر ہتھیلی پر رکھے اس امید میں کھڑے ہیں کہ شاید تم کسی روز شکار کے لئے آجاؤ''۔

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے حضور ﷺ مفلس نہ تھے۔کہیں مفلس بھی سو اونٹ کی قربانی کرسکتا ہے ہمارے حضور بادشاہ تھے اور بڑے بادشاہ تھے کیونکہ بادشاہوں سے بھی ایسا کم سنا گیا ہے کہ کسی نے سو اونٹ کی قربانی کی ہو۔اور حضور ﷺ کا جو فقر تھا وہ اختیاری تھا کیونکہ آپ مال جمع نہ کرتے تھے غرض آپ تارک الدنیا تھے متروک الدنیا نہ تھے۔

حضور ﷺ کی احتیاط

بہرحال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی حضور ﷺ کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئیں دیکھا کہ آپ بقیع میں مردوں کے لئے دعا کررہے ہیں۔اب چاہئے تھا کہ حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا فوراً لوٹ آتیں مگر شاید خیال ہوا ہو کہ شاید آپ مردوں سے فارغ ہوکر زندوں کے پاس جائیں' اس لئے ٹھہر گئیں' اب آپ دعا سے فارغ ہوکر واپس ہوئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی واپس ہوئیں مگر بقیع کو جاتے ہوئے تو یہ پیچھے تھیں اب حضور سے آگے ہوگئیں۔حضور کو شبہ ہوا یہ آگے آگے کون ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیزی کے ساتھ چلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی دوڑیں چونکہ اس وقت یہ ہلکی پھلکی تھیں اس لئے دوڑ کر آپ سے پہلے گھر پہنچ گئیں مگر دوڑنے کی وجہ سے سانس پھول گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو تشریف لائے اور ان کی سانس پھولی ہوئی دیکھی تو فرمایا ((یا عائشة مالك حشيا رائته))۔کہا ''اے عائشہ! تمہاری سانس کیوں پھولی ہوئی ہے'' کہا کچھ نہیں فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بقیع سے لوٹتے ہوئے میرے آگے تم ہی تھیں۔انہوں نے اقرار کیا فرمایا ((اخشيت ان يحيف الله عليك ورسوله)) کیا تم کو یہ اندیشہ ہوا کہ اللہ اور رسول تمہاری حق تلفی کریں گے؟ ہرگز نہیں۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ میں اس قدر احتیاط کی۔ حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اذیت کا کوئی احتمال نہ تھا۔معلوم ہوا کہ حکم مقصود وہی ہے جو فقہا نے فرمایا ہے۔ اور جن واقعات میں جہر بالقراءت صحابہ رضی اللہ عنہم سے رات کے وقت ثابت ہے وہ عارض پر محمول ہے کہ وہاں سب لوگ رات کو اٹھنے والے تھے۔

رفع اشکال

مگر اب یہاں یہ سوال ہوگا کہ کیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رات کو اٹھنا نہ چاہتی تھیں اگر وہ بھی نہ چاہتی تھیں تو پھر دوسری عورتوں کا کیا ٹھکانہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اٹھنا چاہتی تھیں مگر اخیر شب کو اور اس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سویرے اٹھے تھے اس لئے ان کو جگانا نہیں چاہا' بخاری

میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول مذکور ہے ((فاذ اوتر ایقظنی)) کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب وتر پڑھنا چاہتے تو مجھے جگا دیتے یا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے زیادہ محنت لینا گوارا نہ کی ان کو تھوڑی سی محنت میں کامیاب کر دیا ہو۔

جیسے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ آپ نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے محنت کم لی تھی۔ ایک بار یہ سب حضرات خانقاہ تھانہ بھون میں مجتمع تھے۔ مولانا رشید احمد صاحب وغیرہ تو دو بجے اٹھے مولانا محمد یعقوب صاحب نے بھی دو بجے اٹھنے کا قصد کیا۔ حاجی صاحب نے منع فرمایا کہ ابھی نہیں ابھی رات بہت ہے سو جاؤ جب ایک گھنٹہ رات رہ گئی اس وقت جگا دیا کہ اب اٹھو۔ کیونکہ مولانا بہت نازک مزاج تھے۔ اگر زیادہ محنت کرتے تو دماغ پر تعب ہوتا۔

اسی طرح اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا عجب ہے کہ حضرت عائشہؓ سے محنت کم لی ہو محقق وہی ہے جو ہر شخص سے اس کے مناسب کام لے۔ یہ نہیں کہ سب کو چوبیس ہزار ہی اسم ذات بتلایا کرے ہمارے حاجی صاحب نے بعض لوگوں سے صف اتنا کام لیا کہ تم خانقاہ والوں کی کچھ خدمت کر دیا کرو۔ اور کسی کو ایک ہزار دو ہزار اسم ذات بتلایا اور کمال یہ ہے کہ ہر شخص کامیاب تھا۔ تھوڑی محنت کرنے والا بھی۔ تھوڑی محنت کرنے والے کو منزل پر اس طرح پہنچاتے تھے کہ اسے خبر بھی نہ ہوتی تھی اسی کو فرماتے ہیں ؎

نقشبند یہ عجب قافلہ سالار اند		کہ برند ازرہ پنہاں بحرم قافلہ را

''نقشبندیہ حضرات بھی عجب سالار قافلہ ہیں کہ پوشیدہ راستے سے قافلہ کو حرم تک پہنچا دیتے ہیں''۔

محقق کی یہی شان ہے خواہ نقشبندی ہو یا چشتی ہو پس اتباع سنت کی حقیقت یہ نہیں کہ اپنی طبیعت کے تقاضے پر عمل کیا جائے اور اس کی تائید میں ایک دو حدیث ڈھونڈھ لی جائیں۔

تقاضائے اتباع سنت

بلکہ اتباع سنت یہ ہے کہ حضور ﷺ کی عادت غالبہ کا اتباع کیا جائے اور اس کے لئے مطالعہ سیرت نبویہ کی بھی ضرورت ہوگی۔ سیرت نبویہ میں میرا رسالہ نشر الطیب مفصل ہے۔ اگر اتنی فرصت نہ ہو تو حیوۃ المسلمین کا مطالعہ کرلیا جائے اس مین رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا خلاصہ ہے اس لئے جوش محبت مین یہ اعلان بھی کردیا ہے کہ ختم ماہ ربیع الاول تک جس کی فرمائش آئے گی اس سے مخصوص ڈاک بھی نہ لیا جائے گا۔ اور یہ سخاوت میں اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے اطمینان ہے کہ درخواستیں آئیں گی ہی نہیں۔ مسلمان کچھ ایسے بے فکر ہیں کہ ہر شخص اپنے کو بنا بنایا کامل سمجھتا ہے۔ اصلاحِ حال کی فکر ہی نہیں۔ حیات المسلمین کا نسخہ اگر لیں گے بھی تو عمل کے لئے نہیں بلکہ محض برکت کے لئے۔ جیسے شجرہ پڑھا کرتے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحب کا شجرہ تو عمدہ ہے مگر اکثر شجرے تو محض فضول ہیں جن میں بے تکے اشعار ہیں۔ وہ تو بقول علی حزین کے محض تذکرۃ الاولیاء ہی ہیں اور صاحبو! آپ کو ثمرہ کے ہوتے ہوئے شجرہ کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں اگر ثمرہ ایسا ہوتا جس کے خواب ہونے کا اندیشہ ہوتا تو شجرہ کی بھی ضرورت ہوسکتی تھی مگر یہ ثمرہ تو ایسا ہے۔

خاصہ آن خمرے کہ باشد من لدن خود قوی ترمی شود خمر کہن

’’پرانی شراب زیادہ تیز ہوجاتی ہے خاص کروہ شراب جو اللہ کی طرف سے ہو۔ اور اس میں وہ قوت ہے کہ

ہر چند پیر و خستہ وبس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

''ہر چند بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں مگر جس وقت تیرے چہرے پر نظر کرتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں''۔

اس ثمرہ میں فساد کا اندیشہ ہی نہیں اس میں تو اصلاح ہی اصلاح ہے بہر حال حضور ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کرو جس کو میں نے مختصراً حیوۃ المسلمین میں جمع کر دیا ہے میں نے اس کے اول میں یہ شعر لکھا ہے۔

فتوح فی فتوح فی فتوح وروح فوق روح فوق روح

اور اخیر میں یہ لکھ دیا ہے کہ اس مضمون کو روزانہ بلا ناغہ پڑھتے رہیں مین سچ کہتا ہوں کہ اس دور ورقہ کو آپ روزانہ پڑھتے رہے تو ضرور نفع ہوگا ضرور نفع ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ مسئلہ کا بیان تو ہو گیا۔

ربط حدیث

اب یہ سوال ہوگا کہ حدیث سے اس کو کیا مناسبت و ربط ہے جو شروع میں تلاوت کی گئی ہے سو میں اس کو بھی بتلاؤں گا زیادہ ربط نہ ہو مگر مولاء ما میں تو اس سے بھی بڑھ کر بے ربطی گوارا کر لی جاتی ہے جیسے ایک واعظ نے قل ھواللہ احد کی تفسیر میں شہادت نامہ بیان کیا تھا کہ یہ سورت اس رسول ﷺ پر نازل ہوئی ہے کہ جن کے نواسے میدان کربلا میں شہید ہوئے تھے بس اسی ربط سے آپ نے قل ھواللہ کے تحت مین شہادت کا قصہ بیان کر دیا۔

سو میرے بیان میں ایسا مہمل ربط تو ان شاء اللہ تعالیٰ نہ ہوگا۔ اس سے تو میں آپ کو مطمئن کرتا ہوں، ہاں ضعف ربط شاید ہو۔ میرے نزدیک تو ضعف بھی نہیں۔ مگر سامعین کو میں اجازت دیتا ہوں کہ وہ اس ربط کو اگر ضعیف سمجھیں تو

مضائقہ نہیں۔ربط یہ ہے کہ حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ ''میری رحمت غضب پر غالب ہے'' اس کے بعد یہ سمجھئے کہ غضب بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے مگر چونکہ اس کا وقوع کم ہوتا ہے اس لئے اسماءِ الٰہیہ میں کوئی نام ایسا نہیں جو صفت غضب پر دال ہو۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا نام رحمٰن ہے، رحیم ہے، ودود ہے، منتقم ہے مگر غضبان یا غضوب خدا کا نام نہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ اعتبار صفت غالبہ کا ہے اور موصوف کو ہمیشہ صفت غالبہ ہی کے ساتھ موسوم کیا جاتا ہے نہ صفت غیر غالبہ کے ساتھ۔

چنانچہ ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں نزع روح کا بیان ہے کہ ملائکہ جب مسلمان کی روح قبض کرنے آتے ہیں تو اس کو بشارت دیتے ہیں۔((ایھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی روح وریحان ورب غیر غضبان))

کہ ''اے نفس مطمئنہ راحت اور نعمت اور اپنے رب کے پاس چل جو غصہ والا نہیں ہے''۔

اس کے بعد نزع روح کافر کا بیان ہے مگر وہاں یہ نہیں کہ'' اخرجی الی رب غضبان غیر رحمان '' بلکہ صرف عذاب کا ذکر ہے۔پس یوں کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی اصل صفت تو رحمت ہی ہے اور اصلی کے یہ معنی ہیں کہ جس کا ظہور مقتضاء کے ساتھ بھی ہو اور بلا مقتضاء کے بھی ہو یہ خاص اصطلاح ہے جو میں نے تفہیم کے لئے اختیار کی ہے ورنہ صفاتِ قدیمہ سب اصلی ہیں مگر حدیث میں رحمت وغضب میں فرق ثابت ہے۔اس لئے میں اس فرق کو اس عنوان سے جدید اصلاح کے ساتھ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اصلی صفت تو وہ ہے جو بلا مقتضاء بھی ظاہر ہو اور غیر اصلی وہ ہے جو بلا مقتضاء ظاہر نہ ہو پس'' سبقت رحمتی '' کے معنی یہ ہیں کہ رحمت کا ظہور تو مقتضاء سے بھی ہوتا ہے اور بدون مقتضاء کے بھی اور غضب کا ظہور

ہمیشہ مقتضاء ہی سے ہوتا ہے بدون مقتضاء کے نہیں ہوتا اور چونکہ رسول اللہ ﷺ مظہر اتم صفات باری ہیں اس لئے حضور ﷺ کی بھی یہی شان ہے کہ آپ میں رحمت کا غلبہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو رؤف رحیم فرمایا ہے اور سخت کلامی وسنگ دلی سے آپ کی براءت کی ہے:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ﴾(۱)

پس خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تندخو سخت طبیعت ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

صفات اصلیہ کا اتباع

یہ حضور ﷺ کی اصلی صفت ہے اور غضب حدت آپ کی اصلی صفت نہیں بلکہ کسی عارض و مقتضی کی وجہ سے اس کا ظہور ہوا ہے۔ اب بتلایئے کہ حضور ﷺ کا اتباع آپ کی صفاتِ اصلیہ کا اتباع ہے یا صفات عارضیہ کا یقیناً ہر شخص یہی کہے گا کہ حضور ﷺ کا اتباع یہی ہے کہ صفات اصلیہ میں آپ کا اتباع کیا جائے ورنہ حضور ﷺ سے بعض دفعہ نماز فجر بھی قضا ہوئی ہے تو کیا تم بھی اس عارض کا اتباع کر کے ہر روز نماز فجر قضا کیا کرو گے؟ ہر گز نہیں!

یہ مثال عجیب ذہن میں آئی کہ جس نے راستہ کو واضح کر دیا پھر دوسری صفات میں بھی یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کا ظہور عارض کی وجہ سے ہوا ہے پس حضور ﷺ کا اتباع یہ ہے کہ جو افعال وصفات آپ کے اصلی ہیں وہ تمہارے اندر

(۱) سورۂ آل عمران: ۱۵۹۔

بھی اصلی ہوں کہ زیادہ غلبہ اور ظہور انہی کا ہو اور جو صفات اور افعال حضور ﷺ کے لئے عارضی ہیں وہ تمہارے اندر بھی عارضی ہوں اور یہ اتباع نہیں کہ تم حضور ﷺ کے عارضی افعال و صفات کو جن کا ظہور کسی مقتضاء کی وجہ سے نادرا حضور ﷺ سے ہوا تھا اپنے لئے اصلی صفات بنالو کہ اس سے زیادہ توضیح میں نہیں کرسکتا۔

ہاں شاہ فضل الرحمٰن صاحب جیسے بزرگوں کی طرف سے ہم یہ تاویل کرسکتے ہیں کہ جس عارض و مقتضاء کی وجہ سے کبھی حضور ﷺ نے غصہ کیا ہے مولانا کے نزدیک وہ مقتضاء آج کل زیادہ ہے اس لئے مولانا سے ظہور غضب زیادہ ہورہا ہے۔ ایسے بزرگوں کو بھی مریدوں کی اس تاویل سے بے فکر نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اپنی حالت پر نظر ثانی و نظر ثالث کرتے رہنا چاہیئے۔

اندریں راہ می تراش و می خراش تادم آخر دمے فارغ مباش (۱)

بحمد للہ! اس حدیث سے جس مسئلہ کا استنباط ہوا تھا اس کا ربط بھی حدیث کے ساتھ واضح ہوگیا۔

اب ختم کرتا ہوں اور جو مضمون اس حدیث کا مدلول مقصود ہے اس کا ذکر واعظ کا غیر مقصود ہوکر پہلے ہوچکا ہے پس یہ بھی ایک لطفیہ ہوگیا کہ غیر مقصود کا ذکر مقصود ہوکر ہوگیا اور مقصود کا غیر مقصود ہوکر آخر میں تنبیہ کرتا ہوں کہ جو مضمون حدیث کا اصل مقصود ہے اس سے دلیر نہ ہوں بلکہ شرافت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ایسے رحیم و کریم آقا کی اور زیادہ اطاعت کی جائے اور جو مضمون حدیث سے اشارۃ مستنبط کیا گیا ہے اس کو سمجھیں اور اس کے موافق عمل کی کوشش کریں۔

(۱) راہ سلوک میں ہر وقت اپنی نگرانی کرتے رہنا چاہیئے آخری وقت تک بھی غافل نہ رہو۔

اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عمل اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ (۱)

وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد و علی اله واصحابه اجمعین واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین۔

ف(۱) اللہ تعالیٰ محشی اور اس وعظ سے استفادہ کرنے والے تمام احباب کو بھی توفیق عمل اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ آمین

خلیل احمد تھانوی
محرم الحرام ۱۴۳۱ھ